پاکستان میں

نظامِ خلافت

کیا، کیوں اور کیسے؟

بانیٔ تنظیم اسلامی و داعیٔ تحریک خلافت پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کی چار مختصر مگر اہم تحریریں اور ایک مفصل تقریر

مکتبہ خدّام القرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

maktaba@tanzeem.org

مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد ﷫ کی اپنی دلی خواہش اور جدوجہد کے تقاضوں کے عین مطابق' مرحوم کے تمام قانونی وارثین ہر مسلمان کو ڈاکٹر صاحبؒ کی طبع شدہ تصنیفات / تالیفات' آڈیوز' ویڈیوز کو طبع / تیار کر کے شائع کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں (چاہے قیمتاً ہو یا مفت تقسیم) اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہ ہے اور نہ ہوگا' البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ناپسندیدہ کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ' غلط اقتباس' سیاق وسباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت وشہرت پر حرف آئے' تو ہم اس شخص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق محفوظ رکھتے ہیں۔

نام کتاب ———— نظامِ خلافت: کیا' کیوں اور کیسے؟

طبع اول تا ششم (جنوری 2001ء تا جنوری 2015ء) ——— 6600

طبع ہفتم (جولائی 2019ء) ———— 1100

ناشر ——— ناظم نشرواشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ———— 36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

فون: 3-35869501

مطبع ———— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت ———— 100 روپے

ISBN: 978 - 969 - 606 - 058 - 1

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

ترتیب

پاکستان میں نظامِ خلافت: کیا' کیوں اور کیسے؟ 7

- پاکستان کی اساس اور مصورِ پاکستان کے نزدیک پاکستان کا مقصد
- ہماری کوتاہی اور کوتاہ نظری
- انگریز کی وراثت
- پاکستان کے استحکام اور دفاع کا تقاضا
- نظامِ خلافت کے خدوخال
- عملی مَنہاج
- ایک وضاحت' ایک مشورہ!
- عالمی خلافت یقینی! لیکن آغاز کہاں سے؟

عہدِ حاضر میں اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت کا دستوری خاکہ 15

- احکامِ شریعت میں اجمال وتفصیل
- اسلامی ریاست کی دو امتیازی خصوصیات
  - اللہ کی حاکمیت مطلقہ
  - اسلامی قومیت
- عہدِ حاضر میں اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت کے نو دستوری نکات
  - اجتماعی خلافت
  - ریاست کے اعضائے ثلاثہ
  - قانون سازی یا اجتہاد
  - سیاسی جماعتیں
  - آزادی اور پابندی کا حسین امتزاج
  - فقہی اختلافات کا حل
  - صدارتی وفاقی نظام
  - خواتین کی شرکت
  - غیر مسلموں کی حیثیت
- لمحۂ فکریہ

اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کا کردار 31

- خلافت راشدہ کے خصائص
  - پہلی خصوصیت: دورِ نبوت کا ضمیمہ

- دوسری خصوصیت: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درجہ بندی
- سنت خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کا اتباع لازم
- قبائلی معاشرہ اور تمدنی ارتقاء

- تاریخ کا حقیقت پسندانہ مطالعہ
- اخلاقی اور قانونی تعلیمات میں فرق
- ہمارا اصل مسئلہ: اخلاق کا زوال
- حاصل کلام

④ پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار 41

⑤ پاکستان میں نظامِ خلافت: امکانات، خدوخال اور قیام کا طریق کار 49

- اللہ کے تین مشروط وعدے
- قیامت سے قبل خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کی پیشین گوئی
- احیائے خلافت کی جدوجہد کا نبویؐ طریق
- موجودہ عالمی قوت اور اسلام کا مستقبل
- نظامِ خلافت اور اس کے خدوخال
  - اللہ کی حاکمیت اور قرآن وسنت کی بالادستی
  - خلیفہ کا براہِ راست انتخاب
  - مخلوط قومیت کی نفی اور غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ
  - نظامِ صلوٰۃ کا قیام
  - زکوٰۃ کی کامل تنفیذ
  - سود کا کامل انسداد
  - جاگیرداری نظام کا خاتمہ
  - شراب اور جوئے پر پابندی
  - مکمل سماجی اور قانونی مساوات
  - مخلوط معاشرت کا سدِباب
- روحِ عصر کا تقاضا
- موجودہ دَور میں احیائے خلافت کا طریق کار
- احیائے خلافت اور پاکستان کا مستقبل
- نظامِ خلافت کے بارے میں اہم سوالات کے جوابات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

بیسویں صدی کے اوائل میں جو عظیم ''تحریکِ خلافت'' برعظیم پاک و ہند میں چلی تھی اس کی اصل حقیقت ان سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے خلاف احتجاجی ردعمل کی تھی جو عالمی سیاست کی سطح پر خلافتِ عثمانی کے خاتمے کے لیے کی جارہی تھیں —— تاہم جب ۱۹۲۴ء میں خود اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کو منسوخ کر دیا تو یہ تحریک بھی فطری طور پر دم توڑ گئی۔

اس کے لگ بھگ ستّر سال بعد ۱۹۹۱ء میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے ''تحریکِ خلافت پاکستان'' کا آغاز کیا جس کا مقصد پاکستان میں ''نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کا قیام تھا۔

اس ضمن میں سب سے پہلے ستمبر ۱۹۹۱ء میں کراچی پریس کلب میں منعقدہ پریس کانفرنس میں ایک تحریری بیان پیش کیا گیا جو بعد ازاں لاکھوں کی تعداد میں پاکستان کے طول و عرض میں شائع کیا گیا۔ ساتھ ہی قومی اخبارات کے کالموں میں ڈاکٹر صاحب کی نظامِ خلافت کے متعلق بعض نکات کی وضاحت پر مشتمل تحریریں شائع ہوئیں —— پھر ایک مفصّل خطاب موچی دروازہ لاہور کے باہر میدان میں منعقدہ جلسہ عام میں ہوا جس میں عہد حاضر میں نظامِ خلافت کے خدوخال کی وضاحت کی گئی۔

پیش نظر کتاب میں ڈاکٹر صاحب کی متذکرہ بالا چار مختصر تحریریں اور مذکورہ بالا مفصّل خطاب شائع کیے جا رہے ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ ''تحریک خلافت پاکستان'' کے بالکل آغاز کے دور کی چیزیں ہیں۔ بعد ازاں ۹۵-۱۹۹۴ء میں ڈاکٹر صاحب نے کراچی، ملتان، کوئٹہ، پشاور اور لاہور میں تین یا چار روزہ ''خطباتِ خلافت'' ارشاد فرمائے تھے، وہ بھی اولاً ۱۹۹۶ء میں اور بارِ دوم ۱۹۹۷ء میں کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں!)

عبدالرزاق

ناظم اعلیٰ تحریک خلافت پاکستان

۱

پاکستان میں نظامِ خلافت

کیا، کیوں اور کیسے؟

داعی تحریک خلافت پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کا وہ تحریری بیان جو موصوف نے ستمبر ۱۹۹۱ء میں کراچی پریس کلب میں منعقدہ پریس کانفرنس میں پیش کیا —— جسے ''تحریک خلافت پاکستان'' کے نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ تحریر اب سے ۲۸ سال قبل کی ہے اور اب اسے ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔

پاکستان کی اساس اور مصوّرِ پاکستان کے نزدیک قیامِ پاکستان کا مقصد

ہندوستان کی تقسیم دوقومی نظریے کی بنیاد پر عمل میں آئی تھی اور پاکستان مسلم قومیت کی اساس اور اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا۔ چنانچہ مفکّر و مصوّرِ پاکستان علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبہ الٰہ آباد میں برعظیم ہندو پاک کے شمال مغربی علاقے پر مشتمل ایک علیحدہ مملکت کے قیام کی تجویز مسلمانوں کے جداگانہ قومی تشخّص کی بنیاد پر اور ہندو مسلم تنازعے کے مؤثر حل کے طور پر اور اس مقصد کے تحت پیش کی تھی کہ مسلمانانِ ہند کو ایک موقع میسّر آجائے کہ وہ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی (Social Justice) پر جو پردے دورِ ملوکیت میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر سیاسی' معاشی اور معاشرتی عدل وانصاف کے اس نظام کو دوبارہ قائم کرسکیں جو نبی اکرم ﷺ کی ''رحمۃٌ لِلعالمینی'' کا اصل مظہر ہے تاکہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت اور سلامتی کا ایک روشن مینار وجود میں آسکے —— اور اسی طرح بانی و معمارِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے بھی فرمایا تھا کہ ہمیں پاکستان اس لیے مطلوب ہے کہ عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرسکیں۔

ہماری کوتاہی اور کوتاہ نظری

لیکن افسوس! اس کے باوجود کہ قیامِ پاکستان پر قمری حساب سے ساڑھے پینتالیس سال گزر چکے ہیں اور شمسی حساب سے بھی پاکستان اپنی عمر کے پینتالیسویں سال میں قدم رکھ چکا ہے' تاحال اس اصل منزل کی جانب کوئی پیش قدمی نہیں ہوسکی۔ اور ہم پوری وفاداری کے ساتھ اس سیاسی' اقتصادی اور سماجی ڈھانچے کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جو ہمیں انگریز سے وراثت میں ملا تھا —— اور ستم بالائے ستم یہ کہ پاکستان میں بعض نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتوں نے قانونِ شریعت کے نفاذ کے مطالبے کو تو اپنی

سیاست کی اساس بنایا' لیکن اس سیاسی اور معاشی نظام کو ختم کرنے پر مناسب زور نہیں دیا جو جبر و ظلم اور استحصال و استبداد کی اصل بنیاد ہے اور جسے ختم کیے بغیر بہترین قانون کی برکات بھی ظاہر نہیں ہو سکتیں!

انگریز کی وراثت

ہمیں جو سیاسی اور اقتصادی نظام —— اور سماجی اور معاشرتی اقدار انگریز سے وراثت میں ملی تھیں' اور جنہیں ہم نے ''STATUS QUO'' کے انداز میں نہ صرف عملاً بلکہ ذہناً بھی برقرار رکھا ہوا ہے' اس کے اہم خدوخال یہ ہیں:

① مخلوط قومیت یعنی نیشنلزم کا وہ تصور جس نے مغرب کے سیکولرازم کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور جس کی کلی نفی کی بنیاد پر پاکستان کی تحریک چلائی گئی تھی۔

② پارلیمانی جمہوریت جس کی ابتدائی تربیت بھی انگریز نے ہمیں دے دی تھی۔

③ صوبوں کے نام اور حدود جو انگریز نے اپنی انتظامی مصلحتوں کے تحت معین کی تھیں اور جنہیں ہم مستقل اور دائمی ہی نہیں' مقدس سمجھے بیٹھے ہیں!

④ بینکنگ کا وہ نظام جس کی بنا پر ہماری پوری صنعت و تجارت بلکہ پوری معیشت میں سود کی نجاست سرایت کیے ہوئے ہے اور جس کے نتیجے میں گویا پوری قوم اور پورا ملک اللہ اور رسول ﷺ سے برسرِ پیکار ہے۔

⑤ جوئے' سٹے اور لاٹری کی وہ لعنتیں جنہیں قرآن مجید نے ﴿رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّیۡطٰنِ﴾ (شیطان کے ناپاک کام) قرار دیا ہے۔

⑥ جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری (Absentee land-lordism) کا وہ نظام جو ظلم اور استحصال کی سب سے بڑی اور مکروہ ترین صورت ہے اور جس میں دو بار کی نام نہاد اصلاحات کے باوجود کوئی بنیادی فرق واقع نہیں ہو سکا۔

⑦ وہ مخلوط معاشرت جس کے نتیجے میں مغرب میں شرم و حیا اور عفت و عصمت کا دیوالیہ نکلا' گھر کا سکون ختم ہوا اور خاندان کا نظام درہم برہم ہو گیا —— اور یہ آخری شے تو وہ ہے جو انگریز کے دورِ حکومت میں بھی ہمارے معاشرے میں اس

درجہ راسخ نہیں ہو سکی تھی جتنی آج ہے اور روز بروز دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔

پاکستان کے استحکام اور دفاع کا تقاضا

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پورے نظام کو بدلنے کے لیے ایک عوامی تحریک برپا کی جائے' اور اس نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی جائے جس کا مجموعی عنوان ''نظامِ خلافت'' ہے اور جس کے بارے میں مفکّر و مصوّرِ پاکستان نے فرمایا تھا ع ''تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار۔ لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر!'' —— اس لیے بھی کہ یہی قیامِ پاکستان کا اصل مقصد تھا' اور اس لیے بھی کہ یہی پاکستان کے بقاء اور استحکام کا ضامن بن سکتا ہے — چنانچہ اسی مقصد سے انحراف کے باعث لسانی اور علاقائی عصبیتوں نے سر اٹھایا اور مسلمان قوم قومیتوں میں تقسیم ہوئی' اور اس طرح ہم نے اللہ سے جو بدعہدی اور بے وفائی کی اس پر اس کے عذاب کا ایک کوڑا ۱۹۷۱ء میں ہماری پیٹھ پر برسا۔ اور اب بھی اگر ہم نے حصولِ پاکستان کے اصل مقصد کی جانب پیش قدمی نہ کی تو اللہ ربُّ العزّت کی سزا کا دوسرا اور شدید تر کوڑا کسی بھی وقت برس سکتا ہے —— لہٰذا پاکستان کے دفاع کے لیے ایک طرف جہاں یہ ضروری ہے کہ ہم افواجِ پاکستان کو مضبوط سے مضبوط تر بنائیں اور ہر قسم کے سامانِ حرب و ضرب اور ہر طرح کا اسلحہ امکانی حد تک فراہم کریں اور اس ضمن میں اپنے ایٹمی پروگرام سے بھی کسی صورت میں دست کش نہ ہوں' مزید برآں دوست ممالک بالخصوص چین کے ساتھ باضابطہ دفاعی معاہدہ کریں اور بھارت کے ساتھ بھی حتّی الامکان مصالحت اور مفاہمت کی کوششیں جاری رکھیں —— دوسری طرف وہاں پاکستان کا اصل اور حقیقی دفاع اس میں مضمر ہے کہ یہاں اسلام کے ''نظامِ خلافت'' کو بہ تمام و کمال رائج و قائم کر کے ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا......﴾ (الحج: ۳۸) ''اللہ خود دفاع کرے گا اہلِ ایمان کی جانب سے'' کے مصداق اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدافعت کے مستحق بنیں!

اس نظامِ خلافت کے لیے ظاہر ہے کہ صرف عنوان یا لیبل بدلنے کی نہیں، مکمل انقلاب کی ضرورت ہے، جو صرف جانی اور مالی قربانی ہی کے ذریعے رونما ہو سکتا ہے اور جس کے لیے زبردست عوامی تحریک اور انقلابی جِدّوجُہد کی ضرورت ہے —— تاہم جب یہ انقلاب آ جائے گا اور نظامِ خلافت قائم ہو جائے گا تو اس کے نمایاں خدوخال حسبِ ذیل ہوں گے:

نظامِ خلافت کے خدوخال

① اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کا جو اقرار ''قرار دادِ مقاصد'' میں موجود ہے اس کے عملی نفاذ کے لیے قرآن اور سُنّتِ رسول ﷺ کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی جو نظام اور قانون دونوں پر حاوی ہو۔ اور اس کے ضمن میں یہ غیر مشروط اور غیر مبہم صراحت کہ جہاں قانونِ اسلامی کی تدوینِ نو اور اجتہاد کا عمل پارلیمنٹ یا مجلسِ ملی کے ذریعے ہو گا وہاں ملک کی اعلیٰ عدالتوں کو اختیار ہو گا کہ جس قانون کو کلی یا جزوی طور پر قرآن اور سنت کی حدود سے متجاوز سمجھیں اسے کالعدم قرار دے سکیں۔

② مخلوط قومیت کی نفی —— جس کے نتیجے میں خلیفہ کے انتخاب اور قانون سازی کے عمل میں صرف مسلمان شریک ہوں گے اور اس کے لیے ووٹ کا حق تو اگرچہ ہر بالغ مسلمان مرد اور عورت کو حاصل ہو گا لیکن انتخاب میں حصہ صرف ایسے مسلمان مرد لے سکیں گے جن کا کردار مشتبہ نہ ہو —— جبکہ غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی پوری ذمہ داری قبول کی جائے گی اور انہیں عقیدہ و عبادت کے ساتھ ساتھ پرسنل لاء میں مکمل آزادی کی ضمانت دی جائے گی۔

③ خلیفہ کا انتخاب بلاواسطہ پورے ملک کے مسلمان کریں گے اور اسے پارلیمنٹ یا مجلسِ ملی یا مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کا محتاج نہیں بنایا جائے گا، بلکہ موجودہ دنیا کے معروف صدارتی نظام کے مانند ایک متعین مدت کے لیے وسیع انتظامی اختیارات دے جائیں گے۔

④ صوبائی عصبیت کی لعنت کے خاتمے اور عوام کی انتظامی سہولت کے لیے صوبے چھوٹے چھوٹے بنائے جائیں گے اور انہیں زیادہ سے زیادہ حقوق واختیارات دیے جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے موجودہ کمشنریوں کو بھی صوبوں کا درجہ دیا جا سکتا ہے اور یہ بھی طے کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے جغرافیائی' لسانی اور ثقافتی عوامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے صوبے اس طرح تشکیل دیے جائیں کہ کسی بھی صوبے کی آبادی ایک کروڑ سے زائد نہ ہو!

⑤ سود اور جوئے کے کامل انسداد کے ذریعے معیشت کی تطہیر —— اور اس کی بجائے شراکت اور مضاربت کے اصولوں پر نئے تجارتی اور صنعتی ڈھانچے کی تشکیل۔

⑥ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد کی بنیاد پر ایک بالکل نیا بندوبستِ اراضی کہ جو علاقے مسلمانوں نے کسی بھی وقت بزورِ شمشیر فتح کیے ان کی اراضی ''عُشری'' یعنی انفرادی ملکیت نہیں' بلکہ ''خراجی'' یعنی اجتماعی ملکیت ہیں' جن کے کاشتکار' خواہ مسلمان ہوں خواہ غیر مسلم' اسلامی حکومت کو براہِ راست خراج ادا کریں گے' جس سے جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کا بھی مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور اتنا ریونیو حاصل ہوگا کہ بہت سے ٹیکسوں سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

⑦ نظامِ زکوٰۃ کی کامل تنفیذ —— یعنی کُل اموالِ تجارت کی مجموعی مالیت کے اڑھائی فیصد کی وصولی جس سے کفالت عامہ (Social Security) کا پورا نظام —— اور ہر شہری کے لیے روٹی' کپڑا اور مکان جیسی بنیادی ضروریات اور تعلیم اور علاج کی یکساں سہولتوں کی فراہمی کی ضمانت دی جا سکے گی۔

⑧ مکمل قانونی مساوات —— جس میں خلیفۃ المسلمین اور مجلس ملی یا مجلس شوریٰ کے ارکان سمیت کسی کو بھی قانونی تحفظات حاصل ہوں گے نہ ترجیحی حقوق (priviliges)' اگرچہ مفاسد کے سدِباب کے لیے غلط اور جھوٹے الزامات لگانے والوں کے لیے حدِ قذف پر قیاس کرتے ہوئے سخت تعزیری قوانین بنائے جا سکیں گے۔

⑨ شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کے مکمل استیصال کے لیے سخت تعزیراتی قوانین کا نفاذ!

⑩ مخلوط معاشرت کا سدِ باب —— چنانچہ اصولی طور پر مَردوں اور عورتوں کے جداگانہ دائرہ ہائے کار کی تعیین —— اور عملی اعتبار سے تعلیم و تربیت اور علاج معالجے کے لیے کلیتًا جداگانہ ادارے، اور ضرورت پڑنے پر گھریلو صنعتوں کی ترویج، حتیٰ کہ ایسے صنعتی اداروں کا قیام جس میں خواتین ہی کام کریں اور خواتین ہی نگرانی کریں اور ان کے اوقاتِ کار بھی مردوں کے مقابلے میں کم ہوں —— مزید برآں عفت و عصمت کی حفاظت اور قلب و نظر کی پاکیزگی کے لیے ستر اور حجاب کے شرعی احکام کی سختی سے تنفیذ!

عملی منہاج

ظاہر ہے کہ یہ ہمہ گیر اور بنیادی تبدیلیاں نہ سیاسی اور انتخابی عمل کے ذریعے ممکن ہیں، اس لیے کہ سیاسی اور انتخابی عمل کے ذریعے کسی قائم شدہ نظام کو بہتر طور پر چلایا جاسکتا ہے تبدیل نہیں کیا جاسکتا، نہ ہی کسی تدریجی اور جزوی اصلاح کے ذریعے ممکن ہیں، اس لیے کہ اس طرح صرف سطحی تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں بنیادی نہیں، بلکہ اس کے لیے ایک مکمل انقلاب کی ضرورت ہے. جس کے لیے ایک ایسی انقلابی جماعت ضروری ہے جس کے وابستگان پہلے اپنی ذات اور اپنے دائرہ اختیار خصوصاً اپنے گھر میں احکامِ شریعت کو نافذ کریں اور پھر ایک بنیانِ مرصوص کی صورت اختیار کر کے منظّم انداز میں تَن مَن دھن قربان کرنے کے لیے تیار ہوں (چنانچہ اس نظام کو قائم کرنے کی ایک حقیری کوشش کے طور پر ہم نے تنظیم اسلامی قائم کی ہے) لیکن اس سے بھی پہلے یہ ضروری ہے کہ عوامی سطح اور وسیع پیمانے پر نظامِ خلافت کی خصوصیات کا فہم و شعور عام کیا جائے۔ چنانچہ اسی کے لیے ''تحریک خلافت پاکستان'' کا آغاز کیا جارہا ہے اور اس کی ابتدائی کوشش کے ضمن میں آپ حضرات کا تعاون درکار ہے، جس کے سلسلے میں امید ہے کہ آپ مایوس نہیں کریں گے۔

ایک وضاحت اور ایک مشورہ

آخر میں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ جب تک یہ انقلاب برپا نہ ہو' ہم موجودہ سیاسی و انتخابی عمل کے جاری رہنے کے شدت کے ساتھ قائل ہیں اور کسی بھی صورت میں دوسری واحد ممکن العمل شکل یعنی مارشل لاء کی تائید نہیں کرتے جو ہمارے نزدیک پاکستان کے حق میں سمِ قاتل سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ البتہ جو حضرات تہِ دل سے اسلامی انقلاب یا نظامِ خلافت کے قیام کے متمنی ہیں انہیں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس سیاسی و انتخابی عمل سے بالکل کنارہ کش ہو کر اپنی جملہ توانائیاں اس منظّم قوت کے فراہم کرنے کے لیے وقف کر دیں جو نظامِ باطل کو چیلنج کر سکے اور دینی اصطلاح میں ''نہی عن المنکر بِالید'' یعنی ''طاقت کے ساتھ منکرات کے استیصال'' کے لیے منظّم لیکن پُر امن مظاہروں کے لیے میدان میں آ سکے!

عالمی خلافت یقینی! لیکن آغاز کہاں سے؟

قرآن اور حدیثِ رسول ﷺ کی رو سے ہمیں یقین کامل ہے کہ متذکرہ بالا ''نظامِ خلافت'' پوری دنیا میں قائم ہو کر رہے گا ــــــ البتہ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت کس خطۂ ارضی کے حصے میں آئے گی ــــــ اگرچہ گزشتہ چار سو سال کی تاریخ کے حوالے سے امیدِ واثق ہے کہ اس کا نقطۂ آغاز سلطنت خداداد پاکستان ہی بنے گی۔ بہرحال ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے تن من دھن کے ساتھ سعی کریں۔

و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین○○

۲

عہدِ حاضر میں

اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت

کا دستوری خاکہ

احکامِ شریعت میں اجمال و تفصیل

شریعت اسلامی کے احکام کا خاصا بڑا حصہ تو عبادات سے متعلق ہے' جو اگرچہ اسلام میں تو خالص انفرادی معاملہ نہیں ہے بلکہ ان میں بھی اجتماعیت کا رنگ غالب ہے' تاہم قانونی اور دستوری سطح پر ان کو لازماً احوالِ شخصی ہی میں شمار کیا جائے گا۔ پھر اسلام کے اوامر و نواہی کا معتد بہ حصہ بنیادی انسانی اخلاقیات سے متعلق ہے جو نوعِ انسانی اور مذاہب عالم کا مشترکہ ورثہ ہیں۔ اس کے بعد نمبر آتا ہے ان احکامِ شریعت کا جن کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ پھر چونکہ انسانی معاشرے کی اکائی خاندان کا ادارہ ہے اور اجتماعیاتِ انسانیہ کا نقطۂ آغاز رشتہ ازدواج ہے' مزید برآں چونکہ حیاتِ انسانی کا یہ گوشہ ابتدا ہی سے کامل ہے اور اس سے متعلق مسائل و معاملات میں تمدنی ارتقاء کے عمل کے ذریعے کسی تبدیلی کا امکان نہیں تھا' لہٰذا قرآن حکیم نے عائلی قوانین نہایت تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیے۔ اسی طرح چونکہ مرد اور عورت کی نفسیات میں بھی کسی بنیادی تغیر و تبدل کا امکان نہیں تھا' لہٰذا معاشرتی نظام کے ضمن میں بھی معروف و منکر کے تصورات اور ان سے متعلق اوامر و نواہی قرآن مجید میں خاصی وضاحت اور صراحت کے ساتھ عطا کر دیے گئے۔ لیکن انسان کی حیاتِ اجتماعی کے سیاسی و ریاستی اور معاشی و اقتصادی شعبوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے ضمن میں تمدنی ارتقاء کا عمل نزولِ قرآن کے وقت بھی جاری تھا اور تا حال بھی جاری ہے' لہٰذا عقل و منطق کے عین مطابق ان کے سلسلے میں قرآن حکیم نے اساسی اصول اور اہداف تو معین کر دیے' لیکن تفصیلی احکام زیادہ نہیں دیے۔ پھر ان میں سے بھی معاشی اور اقتصادی معاملات سے متعلق تو بعض معین احکام بھی قرآن میں مل جاتے ہیں' جیسے ربا' قمار اور رشوت کی حرمت' خرید و فروخت کے ضمن میں باہمی رضامندی کی شرط' اور احکامِ میراث وغیرہ' لیکن سیاست و ریاست کے سلسلے میں تو واقعہ یہ ہے کہ شریعت اسلامی نے صرف

اصول عطا کیے ہیں‘ معیّن شکل کوئی بھی لازم نہیں کی! (اصل میں یہی بات تھی جو کسی زمانے میں مرحوم اے۔ کے بروہی نے کہی تھی‘ لیکن بعد میں عوامی دباؤ یا ذاتی مصالح کے باعث اس سے رجوع کر لیا تھا۔)

اسلامی ریاست کی دو امتیازی خصوصیات

عہدِ حاضر کی مثالی اسلامی ریاست کا خاکہ کیا ہوگا؟ یا بالفاظِ دیگر دورِ جدید میں اسلام کا نظامِ خلافت ریاست وسیاست کے میدان میں کیا عملی صورت اختیار کرے گا؟ اس سوال کے جواب میں نظری اور فلسفیانہ بحثوں سے قطع نظر راقم جو بات آج تک کے مطالعے اور غور وفکر کے نتیجے میں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ عرض کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ وقت کے اعلیٰ ترین معیارات کے مطابق بلند ترین جمہوری روایات کی حامل ریاست ہوگی جو وطنی قومیت کی اساس پر قائم ہونے والی سیکولر جمہوری ریاست سے صرف دو بنیادی امور میں مختلف ہوگی‘ یعنی:

① اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ

پہلی اور اہم ترین اساسی وجہ امتیاز یہ کہ اس میں حاکمیتِ مطلقہ کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا جائے گا (بقول علامہ اقبال ؎ ”سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے‘ حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!“) جس کا عملی مظہر قرآن وسنت کی نظام اور قانون دونوں پر بلا استثناء اور غیر مشروط بالادستی ہوگی‘ جو ریاست کے دستورِ اساسی میں غیر مبہم انداز میں ریاست کے اصل الاصول کی حیثیت سے ثبت ہوگی۔ گویا اس ریاست کا بنیادی اصول انسانی حاکمیت نہیں‘ بلکہ خلافتِ انسانی کا تصور ہوگا!

② اسلامی قومیت

دوسری اساسی وجہ امتیاز‘ جو متذکرہ بالا اصل الاصول ہی کا منطقی نتیجہ ہے‘ یہ ہے کہ اس کی مکمل شہریت وطنی قومیت پر مبنی ریاست کے برعکس اس کی جغرافیائی حدود کے اندر رہائش پذیر ہر شخص کو نہیں بلکہ صرف ان لوگوں کو حاصل ہو گی جو اللہ اور اس کے رسول

محمد ﷺ پر ایمان کا اعلان و اقرار کریں۔ غیر مسلموں کی حیثیت اس میں اس ''محفوظ اقلیت'' کی ہوگی جن کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا کامل ذِمہ بھی لیا جائے گا (اسی لیے انہیں ''ذِمی'' کہا جاتا ہے) اور جنہیں عقیدہ و عبادات اور عائلی قوانین سمیت پورے پرسنل لاء کے ضمن میں مکمل آزادی کی ضمانت بھی دی جائے گی۔ مزید برآں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی بالکل اسی طرح کی جائے گی جیسے مساجد کی' لیکن چونکہ نظامِ خلافت یا اسلامی ریاست میں قانون سازی کا عمل اپنی اساسی نوعیت کے اعتبار سے کتاب وسنت کی حدود کے اندر اندر ''اجتہاد'' سے عبارت ہوگا اور خلافت کے ''علیٰ منہاج النبوۃ'' ہونے کے باعث اس کا اصل مقصد نبوت کے مشن کی توسیع و تکمیل ہوگا' لہٰذا غیر مسلموں کو نہ قانون سازی کے عمل میں شریک کیا جاسکے گا نہ اعلیٰ سطح کی پالیسی اور حکمت عملی کی ترتیب و تشکیل میں۔

ان سے اعراض کا مطلب

متذکرہ بالا دونوں اصول جو باہم لازم وملزوم بھی ہیں' اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت کے دو لازمی ولابدی خصائص ہیں جو اس سے کسی بھی صورت یا حالت میں جدا نہیں کیے جاسکتے' اور جو مسلمان ان کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی اختیار نہیں کرسکتا اسے صاف کہہ دینا چاہیے کہ وہ اسلام کو صرف عقیدہ اور اخلاقی سطح پر قبول کرتا ہے' نظامِ ریاست وحکومت اور سیاستِ ملک وقوم کی سطح پر اسے یا غیر موزوں اور نامناسب سمجھتا ہے یا ناممکن اور ناقابلِ عمل۔ اس لیے کہ ان میں سے پہلا اصول توحید کا لازمی تقاضا ہے جو اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے' لہٰذا اس کا انکار کفر ہے اور اس میں استثناء کے رخنے ڈالنا شرک ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ کی آیات ۴۴' ۴۵ اور ۴۷ میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ''جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں...... وہی تو ظالم (مشرک) ہیں...... وہی تو فاسق (یعنی سرکش اور باغی) ہیں''۔ اور سورۃ الروم کی آیات ۳۱' ۳۲ میں صراحت کر دی گئی ہے کہ نظامِ اطاعت کے حصے بخرے کر دینا کہ بعض حصوں میں مرکزِ اطاعت اللہ اور رسول ﷺ ہوں اور بعض میں کوئی

اور' حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے۔ مزید برآں سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں شدید تنبیہہ وتہدید فرمادی گئی ہے کہ: ''تو کیا تم ہماری کتاب (یعنی شریعت) کے کچھ حصے کو تسلیم کرتے ہو اور کچھ حصے کو نہیں مانتے؟ تو جان لو کہ تم میں سے جو کوئی بھی یہ روش اختیار کرے گا اس کی سزا دنیا میں بھی ذلت و رسوائی ہو گی اور قیامت کے دن تو انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے!''

رہا دوسرا اصول' تو وہ پہلے اصول کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہونے کے اعتبار سے تمام مسلمانوں کے لیے واجب التسلیم ہونے کے علاوہ پاکستان کے لیے تو جڑ اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے' اس لیے کہ حصولِ پاکستان کی تحریک متحدہ وطنی قومیت کی نفی اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی بنیاد پر چلائی گئی تھی۔ بنابریں اس کا انکار پاکستان کے جواز کی نفی' اور اس سے انحراف پاکستان کے انہدام کے مترادف ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ بھارت کے صحافی اور دانشور پاکستان کی سرزمین پر کھڑے ہو کر پاکستان کی نفی کا یہ لطیف انداز اختیار کرتے ہیں کہ ''ہم نے پاکستان کو تسلیم کیا ہے' دو قومی نظریے کو نہیں!'')

عہدِ حاضر میں

اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت کے نو (۹) دستوری نکات

بہر حال اسلامی ریاست یا نظام کے ان دو اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے ساتھ انسانی حقوق کے بلند ترین تصورات و معیارات اور ریاست و حکومت کے جدید ترین اداروں کو منتھی کیا جا سکتا اور اس طرح انسان کے تمدنی ارتقاء کے جملہ ثمرات سے بھرپور استفادہ کیا جا سکتا ہے' مثلاً:

(۱) اجتماعی خلافت

جب تک انسان کا سیاسی شعور گویا عہدِ طفولیت میں تھا اور انسان صرف بادشاہت یا

شخصی حکومت ہی سے واقف تھا، خلافت اور امامت بھی شخصی ہی ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام سے کہا گیا: ”ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنا دیا ہے، پس لوگوں کے مابین حق و انصاف کے مطابق حکومت کرو!“ (ص: ۲۶) اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا: ”میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں!“ (البقرۃ: ۱۲۴) لیکن جب نوعِ انسانی کا سیاسی شعور بلوغ کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے خلافت اور امامت کو بھی عوامی اور اجتماعی اداروں کی شکل دے دی۔ چنانچہ ایک جانب امامت الناس کی ذمہ داری مجموعی اعتبار سے امت مسلمہ کے حوالے کر دی گئی، جسے اُمت وسط اور خیر اُمت کا خطاب دیا گیا، اور دوسری طرف خلافت بھی عامۃ المسلمین کا حق قرار پائی جو اپنے میں سے کسی کو منتخب کر کے اسے خلافت کے منصب پر فائز کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی حیاتِ دُنیوی کے آخری موقع پر جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مطلع کیا کہ کچھ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ جیسے ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی آنکھ بند ہوئی ہم فوری طور پر فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کر لیں گے تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اتنے مضطرب ہوئے کہ فوری طور پر اجتماعِ عام منعقد کر کے عامۃ المسلمین کو ان لوگوں کے عزائم سے خبردار کرنے کا ارادہ فرمایا: ”جو لوگوں کا حق غصب کرنا چاہتے ہیں“۔ تاہم حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کے مشورے پر آپ رضی اللہ عنہ نے یہ ارادہ مدینہ منورہ واپسی تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ چنانچہ مدینہ واپس پہنچ کر آپ نے ایک عام اجتماع میں مفصل خطاب فرمایا، جس میں مسند احمد بن حنبلؒ کی روایت کی رو سے تو یہ الفاظ شامل تھے کہ ”جس شخص نے کسی امیر کی بیعت مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کر لی اس کی کوئی بیعت نہیں“ اور صحیح بخاری کی روایت کے مطابق الفاظ یہ ہیں: ”جس کسی نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی امیر کی بیعت کی تو نہ اُس کی بیعت کی جائے گی نہ اُس کی جس کی اس نے بیعت کی!“

اسی طرح ”مسلمانوں کے باہمی مشورے“ کا نظام بھی دورِ خلافتِ راشدہ میں تو، جیسے کہ گزشتہ صحبت میں عرض کیا جا چکا ہے، قبائلی اساس اور اس درجہ بندی کی بنیاد پر قائم تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین و فرمودات کی بنا پر اس وقت بالفعل موجود تھی، لیکن موجودہ

زمانے میں اسے بالغ رائے دہی کے اصول کے مطابق ریاست کی جغرافیائی حدود میں رہنے والے تمام بالغ مسلمان مَردوں اور عورتوں تک وسیع کرنے میں کوئی نصِ شرعی مانع نہیں ہے' بلکہ فقہاءِ اسلام کا بیان کردہ اصول کہ ''تمام مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے کفو ہیں'' روحِ عصر کے عین مطابق ہے' اور جس طرح ایک مسلمان باپ کی وراثت میں اس کے محسن ومتقی اور فاسق وفاجر بیٹے برابر کے شریک ہوتے ہیں' ایسے ہی خلیفہ اور شوریٰ یا مجلس ملی کے ارکان کے انتخاب کے ضمن میں رائے دہندگی کے حق کے معاملے میں بھی بالکل ایک دوسرے کے مساوی ہوں گے۔

البتہ قرآن حکیم کی اس ہدایت ابدی کے مطابق کہ ''امانتوں کو ان کے اہل لوگوں کے حوالے کرو'' (النساء : ۵۸) انتخابات میں بحیثیت امیدوار سامنے آنے والوں کی سیرت وکردار کی چھان بین اور سکریننگ کا مؤثر بندوبست ضروری ہوگا' تا کہ ملک وملت کی اہم ذمہ داریوں کی امانت صرف اہل لوگوں ہی کے حوالے کی جا سکے۔ اس سلسلے میں جہاں تک امیدواری کے حلال یا حرام ہونے کا تعلق ہے اس پر گزشتہ صحبت میں گفتگو ہو چکی ہے۔ رہا حقِ رائے دہندگی کے ضمن میں عمر کی تعیین اور علیٰ ہذا القیاس کسی اضافی شرط یا شرائط کا عائد کیا جانا تو یہ بھی مسلمانوں کے باہمی مشورے ہی سے طے ہونے والے امور ہوں گے!

اس پوری بحث میں نظری اعتبار سے تو ان تمام لوگوں کا موقف مختلف ہوگا جو نبی اکرم ﷺ پر نبوت کے خاتمے کے بعد بھی شخصی اور معصوم امامت کے قائل ہیں' لیکن چونکہ ان کی عظیم اکثریت یعنی اثنا عشری شیعہ کے عقیدے کے مطابق فی الوقت امام موجود نہیں ہیں بلکہ غیبت کبریٰ میں ہیں' لہٰذا عملاً وہ بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں تمام اہلِ سنت' (بلکہ واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ کئی صدیوں سے تو ''اجتہاد'' کو ایک زندہ اور متحرک ادارے کی حیثیت سے قائم ہی صرف اہلِ تشیع نے رکھا ہے!) اور یہی معاملہ شش امامیہ حضرات میں سے داؤدی بوہروں کا ہے۔ گویا عملی طور پر استثناء صرف آغا خانیوں یا اسماعیلیوں کا ہے۔ ان کا امام معصوم چونکہ حاضر وموجود ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ اگر روئے

ارضی کے کسی علاقے میں کبھی اسماعیلی ریاست قائم ہوئی تو وہاں خلافت کے لیے انتخاب کا کوئی سوال نہیں ہوگا بلکہ امام حاضر خود یا اس کا کوئی نامزد نمائندہ حکومت کا اختیار سنبھالے گا۔ تاہم چونکہ پاکستان میں اسماعیلی ایک اقل قلیل اقلیت میں ہیں' لہٰذا ان کا معاملہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

۲ ریاست کے اَعضائے ثلاثہ

اسی طرح سب جانتے ہیں کہ عہد حاضر کی ریاست کے تین ''اعضائے رئیسہ'' یعنی مقنّنہ' عدلیہ اور انتظامیہ دورِ خلافتِ راشدہ میں باہم گڈ مڈ تھے اور علیحدہ علیحدہ مشخّص و ممیّز نہ تھے' لیکن ظاہر ہے کہ عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت کی راہ میں تمدنی ارتقاء کے ان عظیم ثمرات سے بھرپور طور پر مستفید ہونے میں کوئی امر مانع نہیں ہے' چنانچہ ایک جانب مقنّنہ ہوگی (جسے مجلس شوریٰ بھی کہا جاسکتا ہے اور مجلس ملی بھی) جس کے ارکان بھی سب مسلمان ہی ہوں گے اور ان کا انتخاب بھی صرف مسلمانوں کی رائے سے ہوگا اور اس کے ذریعے قانون سازی یعنی شریعت اسلامی کی تدوینِ نو اور اجتہاد کا عمل جاری رہے گا۔ دوسری جانب عدلیہ ہوگی جو جہاں شہریوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرے گی اور شہریوں اور انتظامیہ کے مابین عدل قائم کرے گی اور دستور کی رو سے جو حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے ان کی حفاظت کرے گی وہاں دستور کی امین ہونے کے ناطے اس امر کا بھی فیصلہ کرے گی کہ آیا مقنّنہ کا کوئی اختیار کردہ اجتہاد شریعت کے دائرے سے تجاوز تو نہیں کر گیا۔ اور تیسری جانب انتظامیہ ہوگی جو ملک وقوم کے معاملات کے انتظام و انصرام' قانون کی تنفیذ' امن وامان کے قیام اور دفاعِ ملکی کے اہتمام کی ذمہ دار ہوگی۔

۳ قانون سازی یا اجتہاد

اجتہاد کے بارے میں علامہ اقبال کی یہ رائے تو صد فی صد درست ہے کہ اب اجتہاد پارلیمنٹ کے ذریعے ہوگا' لیکن ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اجتہاد کا حق صرف ارکانِ پارلیمنٹ کے لیے مختص ہوگا اور پارلیمنٹ سے باہر اصحابِ علم وفضل اور

اربابِ فہم و دانش کے لیے اجتہاد شجرِ ممنوعہ ہوگا' بلکہ اصل مراد یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی کہ کون سا اجتہاد قانون کا درجہ حاصل کر کے بالفعل نافذ ہوگا۔ تاہم چونکہ اس امر کا فیصلہ کہ آیا کوئی اجتہاد حدودِ شریعت کے اندر اندر ہے یا تجاوز کر گیا ہے' ایک علمی اور فنی معاملہ ہے' لہٰذا عقل و منطق کی رو سے اس کا اختیار ایسی پارلیمنٹ کو نہیں دیا جا سکتا جس کے ارکان محض عمر کے لحاظ سے بالغ مَردوں اور عورتوں کے حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب ہوئے ہوں' قطع نظر اس کے کہ وہ دین و شریعت کے علم سے بہرہ ور ہوں یا تہی دست ہوں۔ اور چونکہ دستور کی اس دفعہ کہ ''یہاں کوئی قانون کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول ﷺ کے منافی نہیں بنایا جاسکے گا'' کی عملی تنفیذ کی نظری طور پر تین ہی صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ اس کا اختیارِ مطلق پارلیمنٹ ہی کو دے دیا جائے' جیسا کہ آج کل جمہوریت کے بہت سے علمبردار کہہ رہے ہیں' لیکن اس صورت میں منطقی طور پر لازم آئے گا کہ پارلیمنٹ میں صرف وہ لوگ شامل ہوں جو شریعت اسلامی کا معتد بہ علم حاصل کر چکے ہوں۔ اس طرح گویا مقنّنہ کا عوامی قاعدہ (Base) بہت محدود ہو جائے گا جس سے روحِ عصر کے تقاضے مجروح ہوں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پارلیمنٹ سے بالاتر ایک ادارہ ہو جو علماء پر مشتمل ہو اور اسے اس فیصلہ کا اختیار ہو کہ آیا جو بل پارلیمنٹ میں زیرِ غور ہے یا منظور ہو کر قانون کا درجہ حاصل کر چکا ہے وہ شریعت کی حدود کے اندر اندر ہے یا نہیں۔ لیکن اس طرح ایک نوع کی تھیا کریسی وجود میں آجائے گی اور یہ بھی روح عصر کے منافی ہے۔ اس کے بعد تیسری رُوحِ دین اور رُوحِ عصر دونوں سے ہم آہنگ واحد صورت یہی رہ جاتی ہے کہ اجتہاد کا اختیار تو پارلیمنٹ ہی کے ہاتھ میں ہو' لیکن اس میں خالص فنی اور علمی معاملے کو ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے سپرد کر دیا جائے کہ آیا کوئی اجتہاد واقعی ''اجتہاد'' ہی ہے' یعنی کتاب و سنت کی حدود کے اندر اندر ہے یا حاکمیتِ خداوندی کو چیلنج کر کے بغی و طغیان اور فسق و فجور کی صورت اختیار کر گیا ہے!

اس ضمن میں موجود الوقت دو عملی بھی صرف عارضی طور پر درمیانی عرصہ کے لیے

گوارا کی جاسکتی ہے کہ ملک کی عام اعلیٰ عدالتیں جدا ہوں اور ایک شریعت کورٹ علیحدہ قائم کی جائے' اور یہ صورت حال تو بہت ہی ناپسندیدہ ہے کہ ان عدالتوں کے ججوں کے نصب و عزل کے معیارات اور قواعد و ضوابط مختلف ہوں —— مستقبل کی مثالی اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ میں تو ظاہر ہے کہ لاء کالج اصل میں کلیۃ الشریعہ ہی ہوں گے اور جملہ وکلاء و جج صاحبان ماہرینِ علمِ شریعت ہوں گے' لہٰذا ایک ہی عدالتی نظام ہوگا اور کسی ثنویت کی قطعاً کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

④ سیاسی جماعتیں

عصرِ حاضر کی ترقی یافتہ اور روشن خیال ریاست کا اہم ادارہ سیاسی جماعتیں بھی ہیں' اور انسان کی حریتِ فکر اور آزادیٔ اظہارِ رائے کی طرح جماعت سازی کو بھی شہریوں کا ایک مسلّم حق سمجھا جاتا ہے۔ عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت میں بھی عوام کو یہ حق بعض پابندیوں اور بعض اضافی آزادیوں کے ساتھ حاصل ہوگا۔ پابندی یہ کہ کوئی سیاسی جماعت یا تنظیم اپنے منشور میں ایسی چیز شامل نہ کر سکے گی جو کتاب و سنت کی نصوص کے منافی ہو۔ اس لیے کہ سیاسی جماعتیں جس نظام کو چلانے کے لیے وجود میں آئیں گی وہ خود بھی انہی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہوگا۔ اور اضافی آزادی یہ کہ ہر رکن پارلیمنٹ' خواہ کسی بھی جماعت کے ٹکٹ پر کامیاب ہوا ہو' روز مرہ کے معاملات میں اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہوگا کہ اپنے ضمیر اور صوابدید کے مطابق رائے دے' اِلّا یہ کہ معاملہ اساسی نوعیت کا ہو اور اس کی رائے بنیادی طور پر اس پارٹی کے منشور ہی کے خلاف جا رہی ہو جس کے ٹکٹ پر وہ منتخب ہوا ہو۔ اس صورت میں عقل و منطق اور دیانت و شرافت' دونوں کا تقاضا ہوگا کہ وہ از خود اپنی نشست سے مستعفی ہو جائے یا بصورتِ دیگر محروم کر دیا جائے۔

⑤ آزادی اور پابندی کا حسین امتزاج

اس پوری بحث کا لُبِ لُباب ایک حدیثِ نبویؐ کے حوالے سے بآسانی چند الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ حدیث مبارکہ کے الفاظ ہیں کہ ''مؤمن کی مثال اس گھوڑے کی

سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہو" (مسند احمدؒ عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ) — اس مثال کو ذرا وسعت دے کر فرض کریں کہ ایک وسیع و عریض میدان ہے جس میں گھوڑے کے بھاگنے دوڑنے کی کافی گنجائش ہے لیکن آپ نہیں چاہتے کہ وہ بالکل آزاد ہو کر فرار ہی ہو جائے' لہٰذا آپ اسے ایک سو گز لمبی رسی کے ذریعے کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں۔ اس طرح سو گز نصف قطر کا ایک دائرہ ایسا وجود میں آ جائے گا جس میں گھوڑا آزاد ہو گا۔ البتہ ایک سو ایک واں گز ہر سمت میں ممنوع یا ناممکن ہو گا۔ ایک اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت میں آزادی اور پابندی کا جو حسین امتزاج ہوتا ہے وہ اس مثال سے اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ دائرے کا محیط کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی نمائندگی کرتا ہے جن سے تجاوز کی اجازت نہ افراد کو ہے نہ بحیثیت مجموعی معاشرے یا ریاست کو' البتہ اس دائرے کے اندر اندر افراد بھی آزاد ہیں اور ریاست اور معاشرہ بھی۔ چنانچہ اس حصے میں عہدِ حاضر کے اعلیٰ ترین معیارات کے مطابق جمہوری اقدار کی ترویج و تنفیذ اور "ان کا معاملہ باہمی مشاورت سے طے ہوتا ہے" کے قرآنی اصول (الشوریٰ: ۳۸) کے تقاضوں کو عہدِ حاضر کے بہترین ترقی یافتہ اداروں کے ذریعے پورا کیا جا سکتا ہے۔

⑥ فقہی اختلافات کا حل

ایک بہت اہم معاملہ جو شریعت کے عملی نفاذ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کی حیثیت سے بالعموم پیش کیا جاتا ہے' فقہی اور مسلکی اختلافات کا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کچھ تو اس مسئلے کی سنگینی واقعتاً اتنی نہیں جتنی بظاہر معلوم ہوتی ہے' اس لیے کہ اس کی اصل حدّت و حرارت' یا جمود اور تعطّل کی پیدا کردہ ہے یا مذہبی پیشہ وارانہ چشمک کا نتیجہ! اور یہ دونوں چیزیں اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت کے قیام سے ازخود ختم ہو جائیں گی۔ مزید برآں ؎

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں!

کے مصداق اس میں بہت کچھ رنگ آمیزی الحاد اور اباحیت کے علمبرداروں نے جان بوجھ کر کر دی ہے۔ تاہم اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ فقہی اختلافات ایک حقیقت واقعی ہیں اور ان کو یکسر ختم کر دینا ممکن ہی نہیں محال عقلی ہے اور عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت میں ان کو مناسب قانونی اور دستوری حیثیت دینا لازمی و لابدی ہے۔

اس اعتبار سے میری یہ بات یقیناً بہت عجیب معلوم ہو گی‘ لیکن میں ابلاغ کی سہولت کے لیے یہ اصطلاح استعمال کر رہا ہوں کہ عہد حاضر کی اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت ’’نیم سیکولر‘‘ ہوگا‘ یعنی جس طرح سیکولر نظام میں کم از کم نظری طور پر تمام مذاہب و ادیان کو شہریوں کے شخصی معاملے کی حیثیت سے برابر تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کے ضمن میں ہر شخص کو مکمل آزادی دی جاتی ہے‘ اسی طرح جدید اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت میں پورے پرسنل لاء اور احوالِ شخصی (بشمول عائلی قوانین) میں جملہ فقہی مسالک برابر تسلیم کیے جائیں گے اور تمام شہریوں کو مکمل آزادی حاصل ہو گی کہ عقیدہ و عبادات‘ پیدائش‘ شادی بیاہ‘ اور تجہیز و تکفین کی جملہ رسومات و تقریبات حتیٰ کہ عائلی قوانین اور احکامِ میراث میں اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کریں (اور جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے‘ یہ آزادی غیر مسلموں کو بھی بہ تمام و کمال حاصل ہو گی)۔ اس ضمن میں مشکل صرف عائلی قوانین کے ضمن میں پیش آ سکتی ہے‘ یعنی ہو سکتا ہے کہ لڑکا کسی ایک مسلک سے تعلق رکھتا ہو اور لڑکی کسی دوسری فقہ کی پیرو ہو‘ اس صورت میں سادہ اور آسان حل یہ ہے کہ نکاح کے موقع پر طے کر لیا جائے کہ اس شادی سے متعلق جملہ معاملات کس فقہ کے تحت طے ہوں گے۔ گویا دونوں میں سے کسی ایک کو صرف عائلی قوانین کی حد تک دوسرے کے مسلک کو قبول کرنا ہو گا۔

اس معاملے میں بھی ہمیں ترقی یافتہ ممالک سے رہنمائی حاصل کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس میں ہرگز کوئی حرج نہیں ہو گا کہ مختلف فقہی مسلک رجسٹر کر لیے جائیں اور ان کے اپنے اپنے اعلیٰ سطحی بورڈ ہوں جو اپنے اپنے مسلک کی

مساجد اور اوقاف کا انتظام سنبھالیں اور حکومت کو اپنے اپنے مسالک سے متعلق امور میں مشورے دے سکیں' یہاں تک کہ عائلی مقدمات کا فیصلہ بھی ان ہی کے حوالے کر دیا جائے۔

باقی جہاں تک قانونِ ملکی' یعنی فوجداری اور دیوانی قوانین' اور ملک کے پورے انتظامی ڈھانچے سے متعلق قواعد وضوابط کا تعلق ہے تو اس معاملے میں دو میں سے کوئی ایک راہ اختیار کی جا سکتی ہے' یعنی ایک یہ کہ ان کے ضمن میں کسی بھی فقہ کو معیّن طور پر نافذ نہ قرار دیا جائے' بلکہ اصل حجت صرف کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول ﷺ ہی قرار پائیں اور تمام مذاہب فقہی اور ان کے اختیار کردہ اجتہادات محض نظائر کی حیثیت سے مشترک علمی ورثہ قرار پائیں۔ اور دوسری یہ کہ ملک کی آبادی کی اکثریت جس فقہ کی پیرو ہو' پبلک لاء میں اسی کو نافذ کر دیا جائے' جیسے کہ فی الوقت ایران میں کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک ان دونوں صورتوں میں بالفعل کوئی زیادہ فرق نہیں ہوگا' اس لیے کہ عملاً تو عہد حاضر کی اسلامی ریاست میں قانونِ اسلامی کی تدوین ازسرِنو ہوگی' اور یہ کام پارلیمنٹ یا مجلس ملی کے ذریعے ہوگا جس کے ضمن میں یہ فیصلہ کہ کہیں کتاب وسنت کی حدود سے تجاوز تو نہیں ہو گیا' ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے ہاتھ میں ہوگا جہاں اصل دلیل صرف کتاب وسنت ہی ہوں گے۔ ملک کی آبادی کی اکثریت کی فقہ کو اگر دستوری حیثیت بھی دی جائے تو اس کا عملی اثر صرف اس حد تک مترتب ہوگا کہ کتاب وسنت سے استدلال اور استنباط میں اس مخصوص مکتبِ فقہ کے اصول اختیار کیے جائیں۔ الغرض ؏ ''مشکلے نیست کہ آساں نہ شود'' کے مصداق یہ معاملہ بھی ہرگز لاینحل نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس ارادے اور عزم کی ہے کہ ہمیں مسلمان جینا اور مسلمان مرنا ہے اور زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں گوشوں کو دین کے تابع کرنا ہے۔

⑦ صدارتی وفاقی نظام

رہا یہ سوال کہ آیا عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست کا دستوری خاکہ پارلیمانی طرز کا ہوگا یا صدارتی طرز کا' اور اسی طرح یہ امر کہ آیا ریاست وحدانی ہوگی یا وفاقی' تو ان میں

سے کتاب وسُنّت کی کسی نص نے کسی بھی صورت کو مسلمانوں پر واجب و لازم نہیں کیا ہے' بلکہ اصولی طور پر یہ معاملہ بھی ﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ کے ذیل میں ہے' لہٰذا کلیتاً ریاست کے شہریوں کی صوابدید پر ہے۔ تاہم اس تاریخی حقیقت کا ذکر کرنا نامناسب نہیں ہوگا کہ دورِ خلافت راشدہ کا نظامِ حکومت جدید تصورات کے اعتبار سے صدارتی اور وحدانی نظام سے قریب تر تھا۔ اور اسی طرح اس ذاتی رائے کے اظہار میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ پاکستان اور بھارت میں جس طرح پارلیمانی نظام کو گویا اصولِ موضوعہ اور ہمیشہ کے لیے طے شدہ فیصلے کی حیثیت دے دی گئی ہے' وہ بھی کسی شعوری اور بالا رادہ انتخاب کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم پر انگریز حکمران تھے اور انہوں نے ہمیں جو ابتدائی تربیت دی وہ اسی نظام کی تھی' جو خود ان کے اپنے ملک میں رائج تھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اگر معروضی طور پر غور کیا جائے تو پاکستان اور بھارت' دونوں کے حالات سے صدارتی نظام زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ البتہ اسے حقیقی معنوں میں وفاقی ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں بھارت نے تو بعض اقدامات کر بھی لیے ہیں' جیسے بہت سے صوبوں کی نئی تشکیل' اور ان کے ضمن میں جغرافیائی حقائق کے ساتھ ساتھ لسانی اور ثقافتی حقائق کا بھی مناسب لحاظ' لیکن پاکستان کو ابھی اس مرحلے سے بھی گزرنا ہے' اور اس کے علاوہ مناسب ہے کہ صوبے چھوٹے چھوٹے بنائے جائیں اور ان کے مابین آبادی کا فرق و تفاوت بھی بہت زیادہ نہ ہو' بلکہ اندازاً تمام صوبے لگ بھگ ایک کروڑ کی آبادی پر مشتمل ہوں (اِلا یہ کہ کسی خاص علاقے میں رقبہ کی نسبت سے آبادی بہت کم ہو' جیسے بلوچستان' تو وہاں کم آبادی پر بھی صوبہ بنایا جا سکتا ہے)۔ مزید برآں روحِ عصر کا تقاضا ہے کہ جملہ وفاقی اکائیوں کو زیادہ سے زیادہ داخلی خود مختاری دی جائے' اور ہر علاقے کے لوگوں کی زبان اور ثقافت کو یکساں اہمیت دی جائے۔ سوائے عربی زبان کے جو ریاست کے اصل الاصول کے منبعوں اور سرچشموں' یعنی کتاب و سنت کی زبان ہے' جس کی تعلیم پوری ریاست میں لازمی قرار دی جائے گی' اور جیسے ہی ممکن ہوا اسی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا جائے گا۔

⑧ خواتین کی شرکت

رہا اس پورے نقشے میں خواتین کی شرکت اور شمولیت کا سوال تو اس سلسلے میں یہ امر تو قطعی طور پر طے ہوگا کہ کوئی عورت خلافت کے منصب پر فائز نہ ہو سکے گی۔ اس لیے کہ یہ اگرچہ حرام مطلق تو نہیں، لیکن مکروہِ تحریمی کی حد تک ناپسندیدہ ضرور ہے۔ اسی طرح یہ رائے بھی پہلے ہی دی جا چکی ہے کہ جہاں خلیفہ اور ارکانِ شوریٰ کی رکنیت کا معاملہ ہے، خواتین کو بھی رائے دہی کا حق حاصل ہوگا۔ البتہ مجلس شوریٰ کا معاملہ اس کے بین بین ہے کہ اگر ان کی مجلس شوریٰ میں شرکت کی گنجائش رکھی گئی ہے، تب بھی ان کے لیے ستر و حجاب کے شرعی احکام کی پابندی لازم ہوگی۔

⑨ غیر مسلموں کی حیثیت

جہاں تک غیر مسلم اقلیتوں کا سوال ہے، اصولی بات تو پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے، صدر ریاست یا خلیفہ اور مجلس شوریٰ کے انتخاب میں ان کو حق رائے دہی حاصل نہیں ہوگا۔ البتہ تمام اقلیتی مذاہب کی ایک مشترکہ مجلس مشاورت یا مختلف مذاہب سے متعلق لوگوں کے علیحدہ علیحدہ مشاورتی بورڈ ان کے ووٹوں کے ذریعے تشکیل دیے جا سکتے ہیں جو ان سے متعلق معاملات کے ضمن میں حکومت کو مشورے دے سکیں۔ یہ معاملہ یقیناً عہدِ حاضر کے مسلّمہ اور مروّجہ نظریات کے بالکل خلاف ہے، لیکن اگر ہم واقعتاً ایک اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں تو، جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، یہ کڑوی گولی بہر صورت نگلنی پڑے گی۔ بصورت دیگر ہم نہ اِدھر کے رہیں گے نہ اُدھر کے ـــــ اور مسلسل۔

”ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!“

کی تصویر بنے رہیں گے!

لمحہ فکریہ

اس کا حتمی فیصلہ ظاہر بات ہے کہ ایک زبردست عوامی تحریک ہی کے ذریعے ممکن ہے، چنانچہ ہماری تمام مذہبی جماعتوں کو غور کرنا چاہیے کہ جب تک ملک کے دستورِ اساسی میں یہ بنیادی امور طے نہ کرا لیے جائیں، ان اسمبلیوں میں شرکت مفید اور مناسب بھی ہے یا نہیں جن میں شمولیت کا پہلا قدم ہی دستور سے کامل وفاداری کا حلف اٹھانا ہوتا ہے! اور کیا صرف یہ خالص نظری اور موہوم سی امید کہ اسمبلی کے ذریعے دستور میں ترمیم بھی کرائی جا سکتی ہے، اس عمل میں تن من دھن کے ساتھ شرکت کے لیے کافی وجہ جواز ہے؟ بَیِّنُوْا تُوجَرُوا —— اب ان شاء اللہ آئندہ صحبت میں ''پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار'' کے موضوع پر گفتگو ہو گی۔

(شائع شدہ نوائے وقت، ۵؍جون ۱۹۹۲ء)

(۳)

اسلامی ریاست میں

سیاسی جماعتوں کا کردار

حال ہی میں ایک اعلیٰ سطحی سرکاری تربیتی ادارے میں خطاب کی دعوت ملی ۔ وہاں گفتگو کے لیے جو موضوع دیا گیا وہ بہت دلچسپ تھا۔ یہ موضوع دو اجزاء پر مشتمل تھا، یعنی ایک ''اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کا کردار'' اور دوسرا ''پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار''—— گویا ایک بحث خالص علمی اور اصولی تھی اور دوسری واقعاتی اور تجزیاتی ۔ وہاں ان دونوں موضوعات پر جو کچھ عرض کیا گیا اسے کسی قدر حک و اضافہ کے ساتھ سلسلہ وار ہدیۂ قارئین کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔ چنانچہ آج اس موضوع کے حصہ اول سے متعلق گفتگو ہوگی اور اس کے بعد پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کے کردار اور اس کے نتائج کا جائزہ لیا جائے گا ۔ بعض مذہبی حلقوں کی جانب سے یہ رائے بہت شدومد کے ساتھ پیش کی جاتی ہے کہ اسلامی ریاست میں سیاسی جماعتوں کا وجود جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تفرقہ اور انتشار کا سبب بنتی ہیں جبکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے تفرقہ اور تحزب کے قبیل کی چیزیں فتنہ اور شرک کے ذیل میں آتی ہیں ۔ اس رائے کے حامل حضرات اپنے موقف کی تائید میں نہ صرف یہ کہ تفرقہ اور اختلاف کی مذمت میں وارد شدہ جملہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پیش کرتے ہیں بلکہ اپنی رائے کو اتحاد و اتفاق کی تحسین و ترغیب پر مشتمل آیات و احادیث کے ذریعے مزید مؤکد کرتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان حضرات کا موقف یہ بھی ہے کہ سیاسی جماعتوں کا وجود اصلاً موجودہ انتخابی نظام کا حصہ ہے اور یہ نظام امیدواری کی اساس پر قائم ہے، جو اسلام کی رو سے حرام ہے ۔ اس طرح یہ پورا سلسلہ بنائے فاسد علی الفاسد کی کامل مثال ہے ۔

جہاں تک اس موقف کے جزو اوّل کا تعلق ہے، یقیناً جو حضرات یہ رائے پیش کر رہے ہیں وہ اپنی اس رائے پر بہت پہلے سے قائم ہوں گے، لیکن امرِ واقعہ بہرحال یہ ہے کہ اس رائے کا اظہار سابق صدر پاکستان، جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دورِ حکومت میں ہوا

جو خود بھی اس کے حامی ہی نہیں پُر جوش مبلغ تھے۔ پھر جنرل صاحب موصوف کی یہ رائے بھی، ہوسکتا ہے کہ اصولی موقف پر مبنی ہو، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ان کی ذاتی اور وقتی مصلحت کے بھی عین مطابق تھی۔ رہا اس مرکب رائے کا جزوِ ثانی، یعنی امیدواری کی حرمت، تو یہ موقف سب سے پہلے جماعت اسلامی نے ۵۱-۱۹۵۰ء میں قیامِ پاکستان کے بعد ہونے والے پہلے انتخابات کے موقع پر اختیار کیا تھا جو پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے لیے ہوئے تھے۔ جماعت اسلامی نے تو ان انتخابات کے نتائج کے پیش نظر اپنے پورے طریق اور اپنی جملہ آراء (مثلاً امیدواری حرام ہے اور پارٹی ٹکٹ لعنت ہے!) سے عملاً رجوع کر لیا تھا، لیکن بعض حضرات تا حال اس موقف کی صحت اور درستی کے قائل ہیں اور اس کے ضمن میں بھی ان کی جانب سے جہاں قرآن مجید کی وہ آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں دنیا میں ذاتی علو اور بالادستی کی طلب کو موجب فساد قرار دیا گیا ہے (جیسے سورۃ القصص کی آیت ۸۳) وہاں ان احادیث کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے جن میں عہدہ کے حصول کی خواہش یا سوال کی مذمت کی گئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ آراء چند در چند مغالطوں پر مبنی ہیں، اور اگر ہم پاکستان میں واقعتاً ایک مثالی اسلامی ریاست کے قیام کے خواہاں ہیں تو ہمیں ان مغالطوں کے ازالے کے لیے کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے، تا کہ قوم کے ذہین اور فہیم عناصر کے شکوک و شبہات رفع ہوں اور اسلام کے نظامِ حکومت و سیاست کی جانب پیش قدمی کی راہ ہموار ہو سکے۔

خلافتِ راشدہ کے خصائص

اس سلسلہ میں اولین اور عظیم ترین مغالطہ، جو اکثر لوگوں کو لاحق ہوا ہے، یہ ہے کہ شاید عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست دورِ خلافت راشدہ کے نظامِ حکومت کا ہو بہو چربہ یا کاربن کاپی ہوگی، لہٰذا سب سے پہلے اسی پر گفتگو مناسب ہے۔

پہلی خصوصیت: دورِ نبوت کا ضمیمہ

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ایک جانب خلافتِ راشدہ کا دور ہماری تاریخ کے عہدِ زرّیں

کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ محبت اور عقیدت کے رشتے کا استوار ہونا عین ایمان کا تقاضا ہے‘ لیکن دوسری جانب اس حقیقت کو ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ دورِ خلافتِ راشدہ کے بعض ایسے خصائص اور امتیازات ہیں جو اس کے نظامِ حکومت میں تو جزوِ لاینفک کے طور پر پیوست تھے لیکن اب دنیا میں دوبارہ کبھی وجود میں نہیں آ سکتے‘ مثلاً اوّلین اور اہم ترین یہ کہ دورِ خلافت راشدہ دورِ نبوت کا ضمیمہ تھا اور اس وقت کا معاشرہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت اور تربیت وتزکیہ کے مبارک اثرات وثمرات سے مالا مال تھا۔ اب نہ دنیا میں دوبارہ دورِ نبوت آئے گا نہ اس کے سے آثار و برکات کا حامل ضمیمہ یا تتمہ!

دوسری خصوصیت: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درجہ بندی

ثانیاً —— دورِ خلافتِ راشدہ میں ہمیں اشخاص وافراد کے مابین ایک درجہ بندی نظر آتی ہے جو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران کی گئی جان گسل انقلابی جدوجہد کے دوران سبقت اِلی الایمان اور ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں صبر ومصابرت‘ ایثار و انفاق اور سرفروشی وجانفشانی کی کیفیت وکمیت کی بنیاد پر وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ چوٹی پر وہ دس صحابہ کرامؓ تھے جو عشرہ مبشرہ کہلاتے ہیں‘ پھر اصحابِ بدر کا درجہ تھا‘ ان کے بعد اصحابِ بیعت رضوان کا شمار تھا‘ وَقِسْ عَلٰی ذٰلِکَ۔ اب ظاہر ہے کہ یہ درجہ بندی نہ صرف یہ کہ فی الوقت موجود نہیں بلکہ آئندہ بھی اگر کوئی جدوجہد اصولی اعتبار سے انقلابِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نہج اور منہاج پر ہوئی تب بھی اگرچہ اس کے کارکنوں میں ایک فطری درجہ بندی تو لازماً قائم ہوگی لیکن اس کے لیے اس قسم کی ”سند“ کا وجود میں آنا محالِ مطلق ہے جو نبی اکرم ﷺ کے فرامین وفرمودات کی بنیاد پر جملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بحیثیت مجموعی اور مختلف صحابہ کو اپنے اپنے مرتبہ ومقام کے اعتبار سے انفرادی اور شخصی حیثیت سے حاصل تھی۔

سُنّتِ خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کا اتباع لازم

دورِ خلافتِ راشدہ کے اس قسم کے خصائص کی بنا پر ہی نبی اکرم ﷺ نے اپنے اس فرمان مبارک میں خلفاء راشدین کی سنت کو اپنی سنت کے ساتھ ہمیشہ کے لیے نتھی کر دیا ہے کہ: ”تم پر لازم ہے میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کی سنت‘ لہٰذا

اسے مضبوطی کے ساتھ دانتوں سے پکڑے رکھو!'' (ترمذیؒ' ابوداوُدؒ' عن عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ) چنانچہ اسی بنا پر فقہاء کرام نے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے اجتہادات کو اجماع کا درجہ دے کر ہمیشہ کے لیے واجب الالتزام قرار دیا ہے۔

قبائلی معاشرہ اور تمدنی ارتقاء

دورِ خلافتِ راشدہ کے ان مثبت خصائص کے ساتھ ساتھ اس امرِ واقعی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ہماری تاریخ کا عہدِ زریں اور دینی اور فقہی اعتبار سے حجت ہونے کے باوجود وہ دور زمان و مکان اور ظروف و احوال کے ایک خاص پس منظر کا حامل ہے۔ چنانچہ جہاں یہ حقیقت ظاہر و باہر ہے کہ چونکہ اس وقت کا معاشرہ خالص قبائلی بنیادوں پر قائم تھا' لہٰذا اُس دور کا نظامِ مشاورت بھی لامحالہ اسی کی اساس پر استوار تھا اور کسی گھرانے کے سربراہ یا قبیلے کے شیخ کی رائے معلوم ہو جانے کے بعد اس کے ایک ایک فرد سے رائے لینا سوائے وقت اور وسائل کے ضیاع کے اور کچھ نہ تھا' وہاں یہ حقیقت بھی مسلّم ہے کہ آج سے چودہ سو سال قبل نوعِ انسانی بحیثیت مجموعی کم از کم سیاسی شعور کے اعتبار سے عہدِ طفولیت میں تھی اور ابھی سیاسی اداروں کے نشوونما کا عمل جاری تھا' جس کا سب سے نمایاں مظہر یہ ہے کہ نہ صرف اس وقت بلکہ بعد میں بھی بہت طویل عرصے تک ''ریاست'' اور ''حکومت'' کے مابین کسی فرق و تفاوت کا فہم اور شعور نوعِ انسانی کو حاصل نہ ہوا تھا' جس کا لازمی اور منطقی' اور نہایت خوفناک نتیجہ یہ تھا کہ حکومت وقت کی مخالفت لامحالہ ''بغاوت'' ہی شمار ہوتی تھی۔ (اور اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو یہی اصل سبب تھا کربلا کے حادثہ فاجعہ کا اور اس کے بعد کے ان متعدد حوادث کا جو حکومت کی تبدیلی کی کوشش کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئے۔)

اس سلسلہ میں ہمیں اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ اگرچہ مسلمان عربوں نے فلسفہ' ریاضی' فلکیات اور طب وغیرہ جملہ علوم زیادہ تر یونان اور کسی قدر ہند سے حاصل کر کے انہیں پروان چڑھایا اور ترقی دی اور پھر ان علوم کو ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے وسطی یورپ کی اقوام' خصوصاً اہل فرانس اور جرمنی کو منتقل کیا

— چنانچہ اسی کے نتیجہ میں ''اصلاحِ مذہب'' (Reformation) کی تحریک بھی برپا ہوئی اور ''احیاءِ علوم'' (Renaissance) کی بھی' لیکن اس کے بعد ہم نہ صرف لمبی تان کر سو رہے بلکہ عیش و عشرت میں محو ہو گئے۔ اور پھر جملہ علوم و فنون کا ارتقاء یورپ ہی میں ہوا۔ چنانچہ وہیں سائنس اور ٹیکنالوجی نے ترقی کی' جس کے نتیجے میں انکشافات و ایجادات کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کی بلندیاں اب ؎

''عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!''

کے مصداق آسمانوں سے باتیں کر رہی ہیں' اور تمدنی اور سیاسی ارتقاء کا عمل بھی یورپ ہی میں آگے بڑھا جس کے نتیجہ میں انسانی حقوق کا تصور بھی پروان چڑھا اور سیاسی ادارے بھی وجود میں آئے۔ اب اگر ہم یورپ کی سائنسی اور تکنیکی ترقی کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے اور زیادہ سے زیادہ یہی اصول اپناتے ہیں کہ نئی ایجادات کا استعمال شریعت کی حدود کے اندر ہونا چاہیے تو یہی اصول ہمیں مغرب کے تمدنی ارتقاء کے ثمرات کے ضمن میں بھی اختیار کرنا چاہیے کہ ان اداروں یا ان کے معمولات میں سے جو بھی قرآن و سنت کی واضح نصوص کی روشنی میں کلّی یا جزوی طور پر ''حرام'' قرار پائیں ان سے تو لازماً اجتناب کریں لیکن باقی سے خواہ مخواہ الرجک نہ ہوں۔

تاریخ کا حقیقت پسندانہ مطالعہ

دورِ خلافتِ راشدہ کے ضمن میں ایک تیسری حقیقت یہ بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس سے جو محبت اور عقیدت ہمارے دلوں میں ہے (اور ہونی چاہیے!) اُسے اِس دَور کے حالات و واقعات کو حقیقی واقعاتی پس منظر میں دیکھنے کی راہ میں حجاب نہیں بننا چاہیے۔ اگر ہم ذرا دیر کے لیے تقدس کے پردے کو ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ اُس دور میں بھی سیاسی پارٹیاں موجود تھیں' اور اگرچہ ابتدا میں وہ خالص قبائلی بنیادوں پر قائم تھیں' جیسے مہاجرین' انصار' یا اوس و خزرج یا بنو ہاشم اور بنو اُمیہ وغیرہ — تاہم کچھ ہی عرصے بعد ان میں شخصیات کا عمل دخل نمایاں ہو گیا تھا۔ چنانچہ شیعانِ علیؓ اور شیعانِ

عثمانؓ دو پارٹیاں وجود میں آگئیں جو ابتدا میں خالص سیاسی اختلافات کی بنا پر ہی وجود میں آئی تھیں۔ ان کی بنا پر مذہبی اور اعتقادی تفرقہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔

اسی طرح ''امیدواری'' اس دور میں جس طرح حرام قرار دی جا رہی ہے اس میں بھی واقعات و حقائق سے صاف اور صریح گریز نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ جہاں تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خلیفہ منتخب ہونے کا معاملہ ہے' سب جانتے ہیں کہ وہ خالص ہنگامی حالات میں ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح بخاریؒ اور مسند احمد بن حنبلؒ میں وارد روایات کے مطابق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صراحتاً واضح کر دیا تھا کہ اسے آئندہ کے لیے نظیر نہیں بنایا جا سکتا اور مسلمانوں کے مشورے کے بغیر خلافت کا فیصلہ گویا مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے کے مترادف ہوگا! اسی طرح حضرت عمرؓ کا معاملہ بھی استثنائی ہے' اس لیے کہ وہ بجائے خود بھی ایک غیر متنازعہ اور متفق علیہ شخصیت کے حامل تھے۔ پھر ان کا انتخاب نہیں ہوا بلکہ انہیں حضرت ابوبکرؓ نے اصحابِ حل و عقد سے استصواب اور مشورے کے بعد نامزد کر دیا تھا۔ لیکن خلیفہ ثالث کے انتخاب کا معاملہ مختلف تھا۔ حضرت عمرؓ خود کسی کے لیے انشراحِ صدر کے ساتھ فیصلہ نہ کر پائے تو انہوں نے معاملہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے حوالہ کر دیا جو عشرۂ مبشرہ میں سے اس وقت موجود تھے —— کہ اپنے میں سے کسی کو خلیفہ چن لیں (یہ ایک نہایت فیصلہ کن مثال ہے اُس دور میں موجود درجہ بندی کی!) گویا یہ اُس وقت کا الیکٹورل کالج تھا۔

اب یہ تفصیل سب کے علم میں ہے کہ ان حضرات میں سے تین نے بقیہ تین کے حق میں ''دستبرداری'' کا اعلان کر دیا۔ بقیہ تین میں سے بھی ایک (حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ) نے اعلان کر دیا کہ اگر باقی دو حضرات فیصلے کا اختیار انہیں دے دیں تو وہ بھی ''دستبردار'' ہو جائیں گے' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تو بتائیے کہ بقیہ دو حضرات جدید اصطلاح کے مطابق ''امیدوار'' کے سوا اور کیا قرار پائیں گے؟ اگرچہ یہ ''امیدواری'' معاذ اللہ حکومت اور اقتدار کی حرص اور ذاتی علو و سربلندی کی خواہش کی بنا پر ہرگز نہ تھی بلکہ اپنی اپنی ترجیحات کے مطابق ملک و ملت کو بہتر سے بہتر انتظامی ڈھانچہ عطا کرنے اور اپنی

اپنی خداداد صلاحیتوں واستعدادات کی مناسبت سے خلافت علیٰ منہاجِ النبوۃ کے مقاصد کو زیادہ سے زیادہ سرعت اور تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھانے کے لیے تھی۔

اخلاقی اور قانونی تعلیمات میں فرق

ایک دوسرا خلط مبحث جو اس قسم کے معاملات میں بالعموم پیش آتا ہے وہ اسلام کی اخلاقی وروحانی اور فقہی وقانونی تعلیمات کے مابین فرق نہ کرنے کے باعث پیدا ہوتا ہے۔ اسلام کی ان دونوں سطحوں کی تعلیمات اکثر وبیشتر معاملات میں مختلف' اور بعض معاملات میں تو متضاد تک ہوتی ہیں' اور اگر ان کے مابین فرق وامتیاز قائم نہ رکھا جائے تو بسا اوقات خالص نیک نیتی کے تحت بھی نہ صرف یہ کہ بڑے بڑے مغالطے پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ عظیم فتنے رونما ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اخلاقی سطح پر تو نبی اکرم ﷺ نے تین بار اللہ کی قسم کھا کر اس شخص کے ایمان کی مطلق نفی فرمائی ہے جس کی کج خلقی کے باعث اس کا پڑوسی امن اور چین میں نہ ہو' لیکن ظاہر ہے کہ اس کی بنا پر کسی کو غیر مسلم یا کافر قرار نہیں دیا جا سکتا اور اسی قسم کی احادیث کی بنا پر خلط مبحث کے باعث خوارج ایسا انتہائی گمراہ فرقہ وجود میں آیا جس نے ایک عظیم فتنے کی صورت اختیار کر لی۔ اسی طرح روحانی اور احسانی سطح پر قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جو کچھ اپنی ضرورت سے زائد ہو اللہ کی راہ میں دے دیا جائے اور اپنے پاس مال جمع نہ کیا جائے۔ دوسری طرف قانونی سطح پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ حلال ذرائع سے جو کچھ کماؤ اس میں سے صرف زکوٰۃ تو لازماً وصول کر لی جائے گی' باقی کے ضمن میں تمہیں اختیار حاصل ہے کہ چاہو تو از خود اللہ کی راہ میں دے دو اور چاہو تو اپنے پاس رکھ لو —— چنانچہ اسی پر زکوٰۃ اور میراث کے شرعی احکام نافذ ہوتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ آیتِ کنز ہی کی بنا پر خالص نیک نیتی سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اس رائے کے شدت سے قائل ہو گئے تھے کہ چاندی سونے کی کوئی بھی مقدار اپنے پاس رکھنا حرامِ مطلق ہے۔ یہی معاملہ تفرقہ وانتشار کی مذمت اور اتحاد اور اتفاق کی ترغیب یا اقتدار کی حرص یا عُلوِ ذات کی خواہش کی مذمت کا ہے۔ یہ ایک اصولی

اور اخلاقی تعلیم ہے، لیکن نہ شعوب وقبائل کی تقسیم وتمیز اس کے منافی ہے جسے اللہ نے خود اپنی جانب منسوب کیا ہے، نہ ہی اس کی نفی اس حقیقتِ واقعی سے ہوتی ہے کہ معاشرے کا ہر فرد ایک نیم آزاد (آٹونومس) تنظیمی وحدت ہے جس کا سربراہ اپنی جگہ "والیٔ امر" اور حدیث نبویؐ کے الفاظ میں "راعی" ہوتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے ملکی وقومی مسائل، خارجی اور داخلی حکمت عملی اور قومی آمد وخرچ (بجٹ) کے ضمن میں ترجیحات کے فرق کی بنیاد پر لوگ علیحدہ علیحدہ سیاسی جماعتوں کی صورت میں منظّم ہوں تو جب تک ہر جماعت اور تنظیم کتاب و سنت کے حدود کے اندر اندر رہنے کی پابندی کا اقرار واعلان کرے، اس میں ہرگز کوئی حرج نہیں ہے اور قرآن وسنت کی کوئی نصِ صریح ایسی نہیں ہے جس سے اس کی حرمت ثابت ہو۔

ہمارا اصل مسئلہ: اخلاق کا زوال

اس مسئلے میں مغالطے کا ایک اور سبب یہ ہے کہ ہم جب بھی ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں، ہمارے پیش نظر اپنا ماحول ہوتا ہے اور ہم اپنے یہاں کی سیاسی جماعتوں کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے رائے قائم کرتے ہیں۔ حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی بھی معاملے کی اصولی حیثیت کو سامنے رکھا جائے، ورنہ ہمارے ہاں جو پیشے مقدس سمجھے جاتے ہیں اگر ان سے وابستہ لوگوں کی بھی اکثریت کے کردار کو سامنے رکھا جائے تو شاید رائے اکثر حالات میں برعکس قائم کرنی پڑے۔ اسی پر سیاسی جماعتوں کے کردار کو قیاس کرنا چاہیے کہ اصل خرابی قومی سطح پر کردار اور اخلاق کے زوال، دیانت وامانت کے فقدان، اور ایفاءِ عہد کے عنقا ہو جانے کی ہے، جس پر مستزاد ہے سیاسی شعور کی کمی اور سیاسی جماعتوں کی استحکام کی راہ میں بار بار کے مارشل لاء کے ادوار کے باعث رکاوٹ، جس کی بنا پر ہم سیاسی اعتبار سے بحیثیت مجموعی ایک "نابالغ" قوم بن کر رہ گئے ہیں اور ملکی سیاست نے خالص ذاتی مفادات کے کھیل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کے برعکس متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کی سیاسی جماعتوں کو دیکھئے کہ داخلی طور پر کتنی مستحکم اور منظّم ہوتی ہیں اور عوامی سطح پر ملک وقوم کے مسائل کے ضمن میں لوگوں کو سوچنے اور غور وفکر کرنے کی دعوت دیتی ہیں اور سیاسی وقومی معاملات کے ضمن میں تعلیم بالغاں کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔

حاصل کلام

اس پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست کے ضمن میں قرآن اور سنت اور دورِ خلافتِ راشدہ سے بنیادی اصول اخذ کرنے ہوں گے اور ان کے ساتھ انسان کے تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں وجود میں آنے والے جملہ اداروں کی پیوند کاری کرنی ہوگی' اس شرط کے ساتھ کہ ان کے اصول و قواعد' یا معمولات و روایات میں جو چیزیں قرآن و سنت کی نصوص کی رو سے حرام ہوں ان کی قطع و برید اور تراش خراش کر دی جائے۔ اس لیے کہ جن اعلیٰ اقدار تک انسان نے اپنے اس طویل تمدنی ارتقاء کے ذریعے رسائی حاصل کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ سب علامہ اقبال کے قول کے مطابق اصل میں ''نورِ مصطفیٰ'' (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی سے مستعار ہیں اور اس سفر کے دوران انسان نے جو ادارے تشکیل دیے ہیں وہ نوعِ انسانی کی مشترک میراث ہیں' اور ان اعلیٰ اقدار اور ان سیاسی و تمدنی اداروں کی برکات سے انسان صرف اس لیے محروم رہ گیا ہے' اور بحر و بر میں فساد اس لیے رونما ہو گیا ہے کہ اس نے فرعون اور نمرود کی پیروی کرتے ہوئے حاکمیتِ مطلقہ کا مدعی بن کر خود ''شارع'' یعنی قانون ساز کی حیثیت اختیار کر لی ہے' اور اگر آج بھی آسمانی ہدایت و شریعت اور تمدنی ارتقاء کے ثمرات کو یکجا کر دیا جائے تو بائبل کی اصطلاح کے مطابق ''زمین پر آسمان کی بادشاہت'' قائم ہو جائے گی اور وہ عالمی نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ وجود میں آ جائے گا جس کے قیام کی صریح اور قطعی پیش گوئیوں کے ساتھ ساتھ اس کی کیفیات کے بارے میں حدیثِ نبوی میں یہ الفاظِ مبارکہ بھی وارد ہوئے ہیں کہ: ''اس سے آسمان والے بھی خوش ہوں گے اور زمین والے بھی۔ چنانچہ اس وقت آسمان بھی نعمتوں کی موسلا دھار بارش برسائے گا اور زمین بھی اپنی نباتات و برکات کے سارے خزانے باہر نکال دے گی!''

آئندہ صحبت میں' ان شاء اللہ' ہم یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اسلامی ریاست کے بنیادی اصول کیا ہیں' اور وہ عہدِ حاضر کی اعلیٰ ترین جمہوری معیارات کی حامل ریاست سے کن کن اعتبارات سے مختلف ہیں۔

(شائع شدہ: نوائے وقت' ۲۹ مئی ۱۹۹۲ء)

(۴)

پاکستان کی قومی سیاست میں

مذہبی جماعتوں کا کردار

پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کے کردار کے مثبت اور منفی پہلوؤں اور اس کے میزانیۂ نفع ونقصان کے موضوع پر گفتگو سے قبل تین باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ ان میں سے دو باتیں تو سادہ بھی ہیں اور مختصر بھی' یعنی ایک یہ کہ یہاں سیاست کا وسیع تر مفہوم پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صرف انتخابی سیاست ہے جس میں حصہ لینے والی جماعتیں الیکشن لڑ کر اس کے نتیجے میں حزبِ اقتدار یا حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرتی ہیں' اور دوسری یہ کہ اس گفتگو میں مذہبی جماعتوں سے مراد بھی صرف وہ مذہبی جماعتیں ہیں جو الیکشن میں براہِ راست حصہ لیتی ہیں' دوسری مذہبی جماعتیں خواہ ان کی سرگرمیاں کتنی ہی وسیع ہوں (جیسے مثلاً تبلیغی جماعت) اور وہ انتخابات پر بھی بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہوں' اس گفتگو کے دائرے سے خارج ہیں۔

تیسری وضاحت جو کسی قدر تلخ بھی ہے اور تفصیل طلب بھی' یہ ہے کہ حقیقتِ واقعی کے اعتبار سے قومی سیاست کا وجود پاکستان کے ابتدائی چند سالوں کے بعد ہی ناپید ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کی سیاست کو ملکی سیاست تو قرار دیا جا سکتا ہے' قومی نہیں! چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس عاجز کے سامنے جیسے ہی یہ موضوع آیا اور اس نے اس پر اظہارِ خیال کے لیے غور شروع کیا تو فوری طور پر ذہن اس روایتی لطیفے کی جانب منتقل ہو گیا کہ جب ایک ضعیف بصارت کے مریض کو ڈاکٹر نے کرسی پر بٹھا کر سامنے کی دیوار پر آویزاں چارٹ پر درج عبارت کو پڑھنے کو کہا تو مریض نے پوچھا ''کون سا چارٹ؟'' اور اس پر جب ڈاکٹر نے کہا ''وہ جو سامنے کی دیوار پر لگا ہوا ہے!'' تو مریض نے سوال کیا ''وہ دیوار کہاں ہے؟'' .... حقیقت یہ ہے کہ بعینہٖ یہی معاملہ پاکستان کی قومی سیاست کا ہے کہ ؏ ''ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے!''

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ مسلم لیگ نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصے کے دوران مسلمانانِ ہند کی عظیم قومی تحریک کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور پورے برعظیم

پاک و ہند کے مسلمانوں کا اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا اتنا ظاہر و باہر اور اس قدر حتمی اور قطعی تھا کہ وقت کی برطانوی حکومت' انڈین نیشنل کانگریس ایسی عظیم سیاسی قوت اور جمعیت علمائے ہند ایسی با اثر مذہبی جماعتوں کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا — لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امر میں بھی ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اس عظیم قومی جِدّوجُہد کے دوران بھی مسلم لیگ اصلاً صرف ایک ''تحریک'' کی حیثیت رکھتی تھی اور اسے ایسی منظّم جماعت کی حیثیت حاصل نہیں تھی جس کے رہنماؤں اور کارکنوں کی صفیں اور درجے مُرتّب اور معیّن ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی پاکستان قائم ہوا مسلم لیگ پر اضمحلال طاری ہو گیا۔ اس ابتدائی اضمحلال کی تلافی کے لیے یہ مصنوعی صورت اختیار کی گئی کہ مسلم لیگ کی صدارت اور ملک کی وزارتِ عظمیٰ کو ایک ہی شخص میں جمع کر کے قومی جماعت کو حکومت کا سہارا دیا جائے۔ لیکن ع ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''، یعنی اس کے بھی برعکس نتائج برآمد ہوئے اور اس طرح مسلم لیگ کی عوامی جڑیں کمزور پڑتی چلی گئیں' یہاں تک کہ جلد ہی وہ صرف سرکار و دربار کی زیبائش و آرائش کا ذریعہ بن کر رہ گئی۔

ادھر مسلّمہ قومی قیادت کے منظر عام سے ہٹنے اور قومی جماعت کے کمزور پڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کی ملکی سیاست صرف وڈیروں' جاگیرداروں' نوابوں اور قبائلی سرداروں کے ذاتی مفادات کا کھیل بن کر رہ گئی اور اس سے میدانِ سیاست میں جو دھما چوکڑی مچی اسے جواز بنا کر ۱۹۵۸ء میں پاکستان کی بری افواج کے کمانڈر انچیف نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ وہ دن اور آج کا دن' پاکستان میں اقتدار کے دو مستقل ستونوں کی حیثیت فوج اور سول بیوروکریسی کو حاصل ہے۔ رہے نام نہاد سیاست دان جن کی غالب اکثریت وڈیروں اور جاگیرداروں پر مشتمل ہے تو وہ اس اقلیم سیاست کے دوسرے درجہ کے شہری ہیں جو لیبل بدل بدل کر مختلف سیاسی جماعتوں کی صورت اختیار کرتے رہتے ہیں اور فلمی دنیا کے ایکسٹرا اداکاروں کے مانند منتظر رہتے ہیں کہ ایوانِ اقتدار کے اصل قابضین میں سے کسی کی نگاہِ کرم کب اور کس پر پڑتی ہے جو کچھ دیر کے

لیے ''جسے پی چاہیں، وہی سہاگن!'' کے مطابق حریم اقتدار میں داخل ہو سکے۔

گویا اس تجزیے کے مطابق تو پاکستانی سیاست میں نام نہاد قومی سیاسی جماعتوں کا کردار بھی ثانوی ہے۔ تو ''تا بہ دیگراں چہ رسد؟'' اور ع ''قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!'' کے مصداق تیسرے نمبر پر شمار ہونے کے قابل علاقائی اور لسانی تنظیموں اور پھر ان کے بھی بعد چوتھے نمبر پر آنے والی مذہبی جماعتوں کے مثبت اور مستقل سیاسی رول کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ پاکستان کی چھیالیس سالہ تاریخ کے دوران صرف ایک مذہبی جماعت کے قائد نہایت مختصر مدت کے لیے پاکستان کے سب سے چھوٹے صوبے کے وزیراعلیٰ رہے، اور وہ بھی ان لوگوں کے سہارے جو علماءِ دین کے لیے اعلانیہ طور پر نہایت رکیک اور توہین آمیز الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں' اور ایک دوسری جماعت کو پاکستان کے سب سے بڑے شہر میں قابل لحاظ عرصے کے لیے اقتدار حاصل رہا لیکن صرف بلدیات کی حد تک!

البتہ ایک دوسرے اعتبار سے مذہبی جماعتیں پاکستان کی سیاست میں نہایت نمایاں اور مؤثر بلکہ فیصلہ کن کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ اگرچہ اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ رول مثبت اور مفید رہا یا منفی اور مضر!...... ہماری مراد مختلف مواقع پر اٹھنے والی احتجاجی تحریکوں سے ہے جن کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً ایوانِ حکومت میں زلزلے آتے رہے اور پاکستان میں اقتدار کی مستقل مثلث زاویے بدلتی رہی۔ چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایوب خان کے خلاف برپا ہونے والی ایجی ٹیشن میں بھی سب سے مؤثر کردار مذہبی جماعتوں کا تھا۔ بعد ازاں بھٹو صاحب کے اقتدار کے خاتمے کا سہرا بھی اصلاً مذہبی جماعتوں ہی کے سر پر تھا اور اسی طرح حال ہی میں ان کی بیٹی کی حکومت کے خاتمے اور پھر الیکشن میں شکست کا کریڈٹ بھی سب سے زیادہ بڑھ کر مذہبی جماعتوں کو ہی جاتا ہے — اور اس کا سبب بھی بالکل واضح ہے کہ عوام کو قربانی پر آمادہ کرنے والا سب سے مؤثر جذبہ مذہبی ہی ہوتا ہے جس کے زیر اثر لوگ جانیں دے دینے کو سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں' تو ظاہر ہے کہ

”منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے!“

کے مصداق احتجاجی مہموں اور مظاہراتی سیاست کے لیے ایسے لوگوں سے بڑھ کر کون موزوں ہوسکتا ہے!

تاہم جیسے عرض کیا جا چکا ہے' اس رول کے مثبت یا منفی ہونے کا فیصلہ کرنا یا اس کا میزانیۂ نفع ونقصان مرتب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے کہ جہاں یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ ان احتجاجی تحریکوں کے نتیجے میں ایسی حکومتوں کا خاتمہ ہو گیا جو مختلف طبقات کو مختلف وجوہات کی بنا پر ناپسند تھیں' وہاں اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ اس سے نہ اسلام کو کوئی حقیقی اور واقعی فائدہ پہنچا' نہ مذہبی جماعتوں ہی کو کچھ حاصل ہوا' بلکہ اینٹی ایوب ایجی ٹیشن کی کمائی بھٹو صاحب نے کھائی اور اینٹی بھٹو ایجی ٹیشن کا فائدہ جنرل ضیاء الحق نے اٹھایا۔ گویا ع ”مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی!“ اس پر مستزاد یہ کہ ان تحریکوں کے نتیجے میں پاکستان میں سیاسی عمل کی گاڑی بار بار پٹڑی سے اترتی رہی جس کے باعث عوام کا سیاسی شعور بھی ناپختہ اور نابالغ (retarded) رہا اور سیاسی ادارے بھی مسلسل شکست وریخت کا شکار رہے!

پاکستان میں قومی سیاست کے ضعف یا فقدان کے اسباب کا ذرا گہرا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہہ میں یہ عقدۂ لاینحل (dillemma) بھی کارفرما نظر آتا ہے کہ حصولِ پاکستان کی تحریک مسلم قومیت کی بنیاد پر چلی اور اس کے دوران عوامی سطح پر سب سے زیادہ زوردار نعرہ اسلام کا لگایا گیا — لیکن جب پاکستان قائم ہو گیا تو ع ”جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا!“ کے مصداق جو واقعی صورتِ حال اور ٹھوس حقائق سامنے آئے وہ یہ تھے کہ اس میں آباد لوگوں کی غالب اکثریت میں اسلام کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی تو تھی' لیکن سیرت وکردار اور اعمال واخلاق کا حال یہ

”وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!“

کا مصداقِ اَتم تھا، یا اس سے بھی بڑھ کر ؂

”جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں!“

اور ؂

”جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!“

کی تصویر کامل! — بلکہ اس سے بھی زیادہ خوفناک صورت حال یہ تھی کہ عوام تو پھر بھی کم از کم عقیدے کی حد تک اللہ اور رسول ﷺ قرآن اور حدیث اور جنت اور دوزخ کے قائل تھے، لیکن تعلیم یافتہ طبقات کا معتدبہ حصہ، جو قومی معاملات میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل تھا ؂

”ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!“

کا منہ بولتا ثبوت اور ع ”میرے اسلام کو اِک قِصّۂ ماضی سمجھو!“ کی مجسم تصویر تھا — اب ظاہر ہے کہ ”جذبات“ کے بل پر ”تحریکیں“ تو چلا کرتی ہیں، لیکن سیاست میں اس کے بالکل برعکس ٹھیٹھ حقائق اور ٹھوس واقعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ چنانچہ پاکستان کی چھیالیس سالہ تاریخ کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو وہ ایک جانب ان ہی ٹھوس حقائقِ واقعی اور دوسری جانب مذہبی جذبات اور امنگوں کی رسہ کشی کا مظہر نظر آتی ہے، اور نصف صدی کے لگ بھگ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی اگر حالات و واقعات کے بین السطور چشمِ حقیقت بیں سے مشاہدہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک جانب ہمارے معاشرے کی عمومی اقدار اور تعلیم یافتہ اور مقتدر طبقات کے مجموعی تصورات اور رجحانات ہیں جن پر عہدِ حاضر کی عالمی تہذیب کے زیرِ اثر مادہ پرستی، الحاد اور اباحیت کی گہری چھاپ ہے، جن کا تقاضا ہے کہ ملک مغرب کے مروّجہ تصورات کے مطابق وطنی قومیت کے اصول پر مبنی ریاست (Nation-State) قرار پائے اور مغرب کے سیاسی اور

اقتصادی نظام کو سماجی اور تہذیبی اقدار سمیت جوں کا توں اختیار کر لیا جائے' اور دوسری طرف مذہبی طبقات اور سیاست کے میدان میں برسرِ عمل مذہبی جماعتیں ہیں جو عوام کے مذہب کے ساتھ جذباتی لگاؤ کے سہارے قانونِ شریعت کی تنفیذ اور اسلام کی تہذیبی اقدار کی ترویج کی جانب زور لگا رہی ہیں۔

اس رسہ کشی کے ضمن میں مذہبی جماعتوں کا یہ دعویٰ تو یقیناً صحیح ہے کہ اگرچہ ہم پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام اور قوانینِ شریعت کے نفاذ میں تا حال کامیاب نہیں ہو سکے لیکن ہماری میزانِ نتائج میں نفع اور کامیابی کے پلڑے میں یہ وزن کیا کم ہے کہ ہم نے یہاں سیکولر نظام کی جڑیں بھی مضبوط نہیں ہونے دیں! —— لیکن قومی اور ملکی سطح پر یہ بات بہت قابلِ غور ہے کہ اس منفی کامیابی (اگر اسے کامیابی قرار دیا جا سکے!) کی قیمت قومی سیاست کے تعطل (stasis) کی صورت میں ادا کی جاتی رہی تو شاید ملک ہی ع ''آں قدح بشکست و آں ساقی نماند'' کے مصداق حصے بخرے (balkanisation) ہو کر ختم ہو جائے اور وہ شاخ ہی باقی نہ رہے جس پر نظامِ اسلام اور قانونِ شریعت کے آشیانے بنائے جا سکیں۔ گویا اس رسہ کشی کے جاری رہنے میں اس بات کا بھی اندیشہ موجود ہے کہ رسہ ہی بیچ میں سے ٹوٹ جائے —— مزید برآں اس تعطیل میں بھی خلا تو بہر حال موجود نہیں ہے اور اس (status quo) کے معنی بھی تو یہی ہیں کہ جاگیرداری نظام بھی جوں کا توں برقرار ہے اور سودی معیشت بھی علیٰ حالہٖ قائم و دائم ہے اور نفاذِ شریعت ایکٹ بھی نافذ ہوا ہے تو ایسا جسے جملہ مذہبی جماعتوں نے ''انسدادِ شریعت ایکٹ'' قرار دیا ہے۔ رہی بات مغربی معاشرت اور اس کے لوازم یعنی عریانی' بے حیائی اور فحاشی کی تو وہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں!

حاصل کلام یہ ہے کہ انتخابی سیاست کے میدان میں سرگرم مذہبی جماعتوں کو اپنی حکمت عملی (strategy) پر نظرِ ثانی کی شدید ضرورت ہے۔ چنانچہ بعض جماعتیں اس وقت اس انداز سے سوچ بھی رہی ہیں' لیکن بحالاتِ موجودہ یہ اندیشہ وہمی اور خیالی نہیں ہے کہ وہ کسی ردعمل کا شکار ہو کر دوسری انتہا کی جانب نکل جائیں اور ماحول کو کم از کم حد

تک سازگار بنائے بغیر اور خود اپنی صفوں کی تربیت واستواری اور کارکنوں کی تربیت اور تزکیے کے ناگزیر تقاضے پورے کیے بغیر تصادم کی راہ اختیار کرلیں۔ جس کا نتیجہ ملک وقوم کے حق میں بھی تباہ کن ہوگا اور دین اور مذہب کے لیے بھی نہایت افسوسناک!......

بنابریں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس منہجِ نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کو اچھی طرح سمجھا جائے جس کے ذریعے تاریخ انسانی کا پہلا اسلامی انقلاب برپا ہوا تھا اور جسے اختیار کیے بغیر ع ''خدایا! آں کرم بارے دگر کُن!'' کی آرزو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتی!

(شائع شدہ: نوائے وقت' ۱۲ جون ۱۹۹۲ء)

۵

پاکستان میں نظامِ خلافت

امکانات‘ خدوخال اور قیام کا طریقِ کار

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡكَرِیۡمِ۔ اَمَّا بَعۡدُ:

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۪ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِیۡنَهُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَهُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِكُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا ؕ وَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾ (النور)

’’وعدہ کرلیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائیں اور عمل صالح کا حق ادا کریں کہ وہ انہیں لازماً زمین میں خلافت عطا فرمائے گا‘ جیسا کہ خلافت عطا کی تھی اُن کو جو اِن سے پہلے تھے‘ اور ان کے لیے ان کے دین کو تمکّن عطا فرما دے گا جو اُس نے ان کے لیے پسند کیا ہے‘ اور ان کے لیے خوف کے بعد امن کی حالت پیدا کر دے گا۔ پھر ایسے لوگ میری ہی بندگی کریں گے‘ کسی کو میرے ساتھ شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ پھر اس (قدر پختہ وعدے) کے بعد بھی جو لوگ روگردانی اختیار کریں (یعنی ایمان و عمل صالح کے تقاضے پورے نہ کریں) تو ایسے ہی لوگ فاسق (نافرمان) ہیں۔‘‘

آج میں اُمتِ مُسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے حوالے سے آپ سے کچھ گفتگو کروں گا اور کچھ بات مستقبل کے بارے میں ہوگی۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم زمانۂ حال ہی میں گم رہنے کے عادی ہو چکے ہیں‘ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا تھا۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق!

زمانۂ حال کے اندر گم ہو جانا بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ سے دُور ہو جانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مطلوب شے تو یہ ہے کہ ماضی سے رشتہ استوار رکھو‘ مستقبل کی فکر کرو اور ان دونوں کو سامنے رکھتے ہوئے زمانہ حال میں اپنے طرزِ عمل کا تعین کرو۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ

ماضی سے بھی رشتہ کٹا ہوا ہو، مستقبل کی بھی فکر نہ ہو تو پھر انسان زمانہ حال کے اندر گم ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ چیز انسان کو ایمان کی بجائے کفر کی طرف لے جاتی ہے۔

اللہ کے تین مشروط وعدے

سورۃ النور کی آیت ۵۵ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے تین نہایت ہی مؤکد وعدے فرمائے ہیں، اگرچہ ہر وعدہ مشروط ہے۔ جیسے دوسرے مقامات پر فرمایا: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا) اور ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا)۔ اسی طرح کا مضمون حدیث میں بھی آیا ہے، فرمایا: ”میرا بندہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی جانب دوڑ کر آتا ہوں، میرا بندہ میری طرف بالشت بھر آتا ہے تو میں اس کی طرف ہاتھ بھر آتا ہوں“۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ بندہ تو اپنا رُخ شیطان کی طرف کیے ہوئے ہو اور اللہ تعالیٰ پھر بھی اس کی طرف متوجہ رہے۔ اگر ہم اللہ کی طرف رخ کر لیں، توجہ کر لیں تو وہ سراپا رحمت ذات ہر وقت رحمت کی بارش برسانے کے لیے تیار ہے ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے راہروِ منزل ہی نہیں!

زیر گفتگو آیت میں بھی اس قاعدہ کلیہ کے حوالے سے دو شرطیں موجود ہیں، یعنی ایمان اور عمل صالح: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾

یہ خطاب مسلمانوں سے ہے۔ مدینہ میں مسلمانوں کے مابین منافقین کا گروہ بھی موجود تھا، چنانچہ یہ وعدہ منافقوں سے نہیں، نام کے مسلمانوں سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ان مسلمانوں سے ہے جو ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کرنے والے ہوں، پہلے خود اپنے اوپر اللہ کے دین کو قائم کرنے والے ہوں، اپنی ذات کی حد تک اللہ کے خلیفہ بن گئے ہوں، اپنے گھر اور اپنے دائرۂ اختیار میں اللہ تعالیٰ کی خلافت کا تقاضا پورا کرتے ہوں اور پھر مل جل کر طاقت اور قوت حاصل کر کے باطل سے ٹکرانے اور پنجہ آزمائی کرنے کو مستعد ہوں۔ باطل نظام سے ٹکر لیے بغیر کوئی کام نہیں بنتا۔ چھوٹے سے چھوٹا

پودا بھی آسانی سے اپنی جڑ نہیں چھوڑتا' ایک جمے ہوئے درخت کو اکھاڑنے کے لیے تو بڑی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح رائج الوقت باطل نظام آسانی سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے لوگوں کو اپنی جانوں کی قربانی پیش کرنا پڑے گی' خون کی ندیاں بہانا پڑیں گی۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے خون کا نذرانہ پیش کرنا پڑا تو ہم میں سے کون ایسا ہے جو اس سے استثناء چاہتا ہو؟ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون طائف کی سرزمین میں جذب ہوا اور آپؐ کا خون دامنِ اُحد میں گرا تو اور کون شخص یہ کہے گا کہ خون دیے بغیر ایسا ہو سکتا ہے!

ہمارے سامنے تو کتنی ہی روشن اور تابناک مثالیں موجود ہیں۔ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اگر جہاد ہو گا تو ہمارے لیے اللہ کے تین وعدے ہیں جو اس آیہ مبارکہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ ہمیں لازماً زمین میں خلافت عطا فرمائے گا' جیسے اس سے پہلے عطا کی گئی تھی۔ بنی اسرائیل بھی اس زمرے میں آتے ہیں اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو بھی بڑی ہی عظیم الشان مملکت عطا کی گئی تھی۔ حضرت سلیمانؑ کی حکومت ہوا اور جنات پر تھی۔ یہ استخلاف اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو عطا فرمایا تھا۔ مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں ایسا ہی' بلکہ اس سے بھی بڑا استخلاف عطا فرمائے گا اگر تم ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کرو گے۔ دوسرا وعدہ یہ کہ اس دین کو جسے اللہ نے تمہارے لیے پسند فرمایا ہے' تمکن عطا کرے گا' کیوں کہ حق کا یہ حق ہے کہ وہ غالب ہو نہ کہ مغلوب۔ مغلوب تو باطل کو ہونا چاہیے ''اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیْهِ'' حق تو غالب رہنے کے لیے آیا ہے جب کہ مغلوبیت باطل کا شیوہ ہے۔ تاہم حق کے غلبے کے لیے اہل حق کو قربانی دینا پڑتی ہے۔ تیسرا وعدہ یہ ہے کہ وہ ہماری خوف کی حالت کو حالت امن سے بدل دے گا۔ خوف کی یہ حالت مکہ میں بھی تھی' جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ستایا جاتا تھا' ایذائیں پہنچائی جا رہی تھیں۔ مدینہ میں بھی ہر وقت خوف کی حالت طاری تھی' کبھی مکہ سے مشرکین کی فوجوں کی آمد کا خطرہ رہتا تو کبھی مشرق سے یہودیوں کی سازشیں تھیں' مگر اللہ تعالیٰ نے اس صورتِ حال کو امن سے بدل دیا۔

ان تین مؤکد وعدوں کا نتیجہ بیان فرماتے ہوئے کہا کہ پھر یہ لوگ میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ یہی سو باتوں کی ایک بات ہے اور دین کی حقیقت بھی یہی ہے۔ اسلام دین توحید ہے۔ بندگی، اطاعت، قانون اور حکم سب اللہ کا ہے کہ ﴿اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ﴾ (یوسف: ۴۰) (حکم دینے کا اختیار سوائے اللہ کے کسی کو بھی حاصل نہیں ہے، اور اُسی نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اُس کے سوا کسی کی بندگی اور اطاعت نہیں ہوگی۔) آخر میں فرمایا: ﴿وَمَنۡ كَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۝۵۵﴾ اتنے پختہ وعدوں کے بعد بھی اگر لوگوں کو اعتبار نہ آئے اور پھر بھی مسلمان اپنی جان اور مال لگانے کو تیار نہ ہوں، یہ لوگ پھر بھی اس کام کے لیے کمر ہمت کسنے کو تیار نہ ہوں اور اتنے پختہ وعدوں کی بھی ناقدری کریں تو پھر یہ لوگ فاسق ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے اپنی نگاہِ کرم پھیر لے گا۔

سورۃ النور کی اس آیت میں خلافتِ ارضی کا جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کیا ہے، وہ ایک مرتبہ پورا ہو چکا ہے۔ خود حضور ﷺ کی زندگی میں سرزمینِ عرب پر غلبۂ دین مکمل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ کے عہد میں پورا شمالی افریقہ اور مشرق میں پورا ترکستان کا علاقہ، جو ستر (۷۰) برس کے بعد روسی استبداد کے پنجے سے اب آزاد ہو رہا ہے، اسلامی ریاست میں شامل ہو گیا۔ گویا بحرِ اوقیانوس سے دریائے جیحوں تک کے پورے علاقے میں خلافت کا نظام قائم ہو گیا۔ یوں خلافتِ ارضی کے وعدۂ الٰہی کی تکمیل ہو گئی، قیصر و کسریٰ کی بادشاہتیں ختم ہو گئیں، کرۂ ارضی کے ایک بڑے حصے پر اللہ کا دین غالب ہو گیا اور اللہ کی حاکمیت قائم ہو گئی۔ یہ سب کچھ ہمیں بھی تاریخی اعتبار سے معلوم ہے اور دنیا بھی اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتی۔

قیامت سے قبل ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کے قیام کی پیشین گوئی

حضور ﷺ نے یہ پیشین گوئی فرمائی ہے کہ دنیا کے خاتمے سے پہلے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا یہ نظام بالفعل دوبارہ قائم ہوگا اور خلافت کے اس نظام کا غلبہ اب عالمی سطح پر پورے کُرۂ ارضی پر ہوگا۔ وہ صرف بحرِ اوقیانوس سے دریائے جیحوں تک ہی نہیں

ہوگا بلکہ کُل زمین پر ہوگا۔ شاید آج کے حالات میں لوگوں کو یہ باتیں بڑی عجیب لگیں کہ آج تو مسلمان پسماندہ ہیں' مغلوب ہیں' دبے ہوئے ہیں' امریکہ کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ مگر ان سب حالات کے باوجود احادیثِ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کیا کہتی ہیں' آیئے دیکھتے ہیں۔ مسند احمد میں موجود حدیث کے مطابق حضور ﷺ نے پانچ اَدوار کا ذکر فرمایا۔ چشمِ تصور سے ملاحظہ فرمایئے! حضور ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے سامنے خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں اور یہ خبر دے رہے ہیں' آپ ﷺ نے فرمایا:

((تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ اِذَا شَآءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا))

''تمہارے اندر نبوت کا دَور رہے گا جب تک اللہ چاہے گا کہ رہے' پھر اللہ اسے اٹھالے گا جب اٹھانا چاہے گا۔''

یعنی جب تک حضور ﷺ موجود رہے' مجسّم نبوت کا دَور جاری رہا اور پھر حضور ﷺ ((اَللّٰهُمَّ فِی الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰی)) کہتے ہوئے دنیا سے پردہ فرما گئے تو وہ دَور ختم ہوگیا۔ پھر حضور ﷺ نے دوسرے دور کا ذکر فرمایا:

((ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰی مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ))

''پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی۔''

یعنی نبوت کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے طریقِ نبوّت پر خلافت قائم ہوگی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو دینِ حق کے غلبے کے لیے مبعوث فرمایا تھا' آپؐ کو اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ نبوّت کا یہ مشن خود حضور ﷺ کی زندگی میں جزیرہ نمائے عرب کی حد تک پورا ہوگیا تھا' مگر اسے ابھی آگے بڑھنا تھا' لہٰذا وہ آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ:

((فَتَكُوْنَ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اللّٰهُ اِذَا شَآءَ اَنْ يَّرْفَعَهَا))

''پس یہ (دوسرا دَور بھی) جاری رہے گا جب تک اللہ چاہے گا کہ رہے' پھر اللہ جب چاہے گا اسے بھی اٹھالے گا۔''

اس کے بعد حضور ﷺ نے تیسرے دَور کے بارے میں فرمایا:

((ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا))

''اس کے بعد کاٹ کھانے والی حکومت کا دَور آئے گا۔''

کٹ کھنی حکومت کا یہ دَور بنواُمیہ اور بنوعباس کی ملوکیت کا دَور ہے۔ خلافت تو درحقیقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر ختم ہوگئی تھی' چنانچہ اہلِ سُنّت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت کو عہدِ خلافتِ راشدہ میں شامل نہیں کرتے۔ اسی ملوکیت کے دور میں کربلا کا حادثۂ فاجعہ رونما ہوا جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ شہید کردیے گئے' پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو مکہ مکرمہ میں شہید کیا گیا۔ اسی عہدِ ملوکیت میں واقعہ حرہ کے نتیجے میں مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم تباہ ہوا۔ اسی دَورِ ملوکیت میں حجاج بن یوسف کے ہاتھوں سینکڑوں تابعی رحمۃ اللہ علیہم شہید ہوئے' محمد بن قاسم کو سندھ سے واپس بلاکر شہید کر دیا گیا' اس لیے کہ بادشاہت کا تو یہ خاصہ ہوتا ہے کہ بادشاہ کسی دوسرے شخص کے مقبول ہونے سے ڈرنے لگتا ہے۔ بادشاہوں کے سامنے اپنے ذاتی مفادات ہوتے ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے وہ لوگوں پر ظلم وستم کا بازار گرم کردیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق یہی دَورِ ملوکیت کاٹ کھانے والی حکومتوں کا دَور ہے۔ اس کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّرْفَعَهَا))

''یہ دَور بھی رہے گا جب تک اللہ چاہے گا کہ رہے' پھر اللہ جب چاہے گا اسے بھی ختم فرمادے گا۔''

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھے دَور کا ذکر فرمایا:

((ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيًّا))

''پھر جابرانہ بادشاہت کا ایک دور آئے گا۔''

آج چودہ سو برس کی تاریخ کھلی کتاب کی مانند ہمارے سامنے موجود ہے جس کی وجہ سے ہم یہ باتیں بہت اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جابرانہ بادشاہت سے مراد غیروں کی غلامی کا زمانہ ہے۔ کسی علاقے پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا تو کہیں فرانسیسیوں نے' کہیں ولندیزیوں نے اور کہیں اطالویوں نے اپنے پنجے گاڑ لیے۔ بنواُمیہ اور بنوعباس

کے خلفاء چاہے خلفاءِ راشدین نہیں تھے مگر تھے تو مسلمان ہی۔ پھر انہی میں سے اچھے لوگ بھی سامنے آئے۔ انہی میں عبدالملک بن مروانؒ جیسے بڑے محدّث اور فقیہہ انسان بھی تھے اور عمر بن عبدالعزیزؒ بھی جنہیں خلیفہ راشد تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب یہ دَور بھی ختم ہوا تو غیروں کی حکومت آ گئی۔ برصغیر کی یہ سرزمین انگریزوں کے تسلط میں آنے سے پہلے سکھوں کے قبضے میں تھی۔ دورِ غلامی کی یہ حکومت آہستہ آہستہ تمام مسلم علاقوں سے ختم ہو گئی ہے۔ اگرچہ غلامی کا یہ دَور ابھی پورے طور پر ختم نہیں ہوا۔ انڈونیشیا آزاد ہوا' ملائیشیا آزاد ہوا' تمام عرب ممالک آزاد ہوئے' مگر ذہنی غلامی جوں کی توں قائم ہے' تہذیبی غلامی پہلے سے بھی زیادہ ہے' معاشی غلامی کے بندھنوں میں بھی ہم جکڑے ہوئے ہیں۔ ہماری اس حالت کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

مملکت خداداد پاکستان میں ہم آج بھی انگریزوں کے چھوڑے ہوئے نظام کو جوں کا توں لے کر چل رہے ہیں۔ سیاسی نظام بھی وہی' تمدنی اَقدار بھی وہی' معاشی نظام بھی وہی' غرض سارا نظام وہی۔

یہ دَور جس میں ہم سانس لے رہے ہیں' یہ چوتھے اور پانچویں دَور کا درمیانی عرصہ ہے۔ اس دَور کے اختتام پر پانچواں دَور آئے گا۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ اس دَورِ سعید کو جلد لائے اور اس دَور کو لانے کے لیے اللہ تعالیٰ ہماری زندگیوں کو قبول فرمالے۔ ہماری کامیابی اسی میں ہے کہ ہم اس راہ میں اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ دَور لازماً آئے گا جس کی خبر نبی اکرم ﷺ نے ہمیں دی ہے کہ آپؐ سچے ہیں اور آپؐ کے سچے ہونے کی گواہی دی گئی ہے' لہٰذا آپؐ کی دی ہوئی خبر کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔

حضور ﷺ نے پانچویں دَور کے بارے میں ارشاد فرمایا:

((ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ))

''پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو گی۔''

یعنی پھر پہلے ہی کی طرح خلافت کا دَور آئے گا جو نبوت کے نقشے پر ہی قائم ہوگا اور نبوت کے مشن کے لیے ہوگا۔ راوی کے مطابق ان پانچ ادوار کی خبر دینے کے بعد حضور ﷺ نے سکوت اختیار فرمایا۔ حدیث کے آخری الفاظ ہیں:

ثُمَّ سَکَتَ ''پھر آپؐ خاموش ہوگئے۔''

معلوم ہوا کہ اس پانچویں دَور پر ہی دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس وقت نوعِ انسانی پانچویں دَور کی دہلیز پر کھڑی نظر آ رہی ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اب جب نظامِ خلافت قائم ہوگا تو وہ عالمی سطح پر قائم ہوگا۔ اس ضمن میں آنحضور ﷺ کا ارشادِ مبارک ملاحظہ فرمائیے۔ یہ حدیث حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں روایت کی گئی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَھَا وَ مَغَارِبَھَا' وَ اِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُھَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْھَا))

''اللہ نے میرے لیے زمین کو لپیٹ دیا' پس میں نے زمین کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور سارے مغرب بھی' اور میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو کر رہے گی جو مجھے لپیٹ کر دکھائے گئے۔''

ایک اور حدیث میں جو مسند احمدؒ کی ہے' نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَایَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَہُ اللّٰہُ کَلِمَۃَ الْاِسْلَامِ ، بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَذُلِّ ذَلِیْلٍ))

''روئے ارضی پر نہ کوئی گھر جوائینٹ گارے سے بنا ہوا ہو' باقی بچے گا' نہ کمبلوں سے بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کردے! خواہ کسی سعادت مند کو عزت دے کر خواہ کسی بد بخت کی مغلوبیت کے ذریعے۔''

یعنی اس داخلے کی دو شکلیں ہوں گی۔ یا تو عزت والے کے اعزاز کے ساتھ یا ذلیل کی تذلیل کے ساتھ۔

((اِمَّا یُعِزُّھُمُ اللّٰہُ فَیَجْعَلُھُمْ مِنْ اَھْلِھَا، اَوْ یُذِلُّھُمْ فَیَدِیْنُوْنَ لَھَا))

''یا تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عزت عطا فرما دے گا کہ انہیں اس (کلمۂ اسلام) کا

قائل وحامل بنادے گا‘ یا انہیں مغلوب فرمادے گا کہ اس کے محکوم بن جائیں۔“

یعنی اگر گھر والا خود اپنی مرضی سے اسلام کو قبول کرلے گا تو یہ صورت اعزاز کی ہوگی‘ اس لیے کہ ﴿وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ کہ عزت تو اللہ کا حق ہے‘ اُس کے رسول ﷺ اور اہل ایمان کا حق ہے۔ چنانچہ گھر والا اسلام قبول کر کے اس عزت میں شامل ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ اسلام قبول نہیں کرے گا تو اسلام تب بھی اس کے گھر میں داخل ہوگا۔ اس صورت میں از روئے فرمانِ الٰہی: ﴿یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ﴿۲۹﴾﴾ (التوبۃ) اسے جزیہ دینا ہوگا‘ اسے اسلام کی بالادستی قبول کرنا ہوگی‘ اسے اسلامی قانون کی پابندی کا عہد کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں اسلامی افواج کا کمانڈر ہمیشہ دشمن کے سامنے تین باتیں رکھتا تھا۔ ایک یہ کہ اسلام لے آؤ تو تم لوگوں کو ہمارے جیسی حیثیت حاصل ہو جائے گی‘ تمہاری جان‘ تمہارا مال‘ تمہاری عزت اتنی ہی محترم ہوگی جتنی خود ہماری ہے‘ تم ہمارے برابر کے بھائی بن جاؤ گے — اگر تمہیں یہ صورت قبول نہیں تو تم اپنے مذہب پر رہتے ہوئے ہمیں جزیہ ادا کرو اور اللہ کے دین کی بالادستی کو تسلیم کرلو — لیکن اگر تمہیں یہ شرط بھی قبول نہیں تو میدان میں آؤ‘ تلوار ہمارے اور تمہارے مابین فیصلہ کردے گی۔ اسلامی تاریخ سے اس حد تک تو ہر مسلمان واقف ہے کہ ہر جنگ سے پہلے یہی تین باتیں کہی جاتی تھیں‘ چوتھی بات کوئی نہ تھی‘ کیونکہ حقیقی مسلمان کفر کے غلبے کو برداشت کر ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر اس کی طاقت نہیں تو کفر کے غلبے کو ختم کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اسی جدوجہد میں جان دے دے تو ایسا شخص اللہ کے ہاں کامیاب سمجھا جائے گا۔

احیاءِ خلافت کی جدوجہد کا نبویؐ طریق

ان احادیث کے حوالے سے یہ بات بخوبی واضح ہو چکی ہے کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دَور دوبارہ آئے گا اور یہ خلافت عالمی سطح پر قائم ہوگی۔ اس تصور کو قرآن مجید نے بھی بیان کیا ہے۔ آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ میرا بنیادی کام ہی قرآن مجید کو پڑھنا اور پڑھانا ہے۔ ہماری دعوت کا پہلا قدم ”رجوع الی القرآن“ ہے۔ اسی مشن میں

میری پوری عمر لگ گئی ہے اور اب میرا آخری قدم ’’رجوع الی الخلافہ‘‘ ہے۔ حضورﷺ نے مکہ مکرمہ میں قرآن پڑھ کر سنایا اور مدینہ منورہ میں خلافت کا نظام قائم فرما دیا۔ یہی تدریج اور یہی طریقہ ہے جو میں نے حضورﷺ کی سیرت سے سیکھا ہے۔ حضورﷺ کے ہاتھوں یہ مشن بالفعل پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا‘ لیکن ہم اگر اسی کام میں اپنی جانیں لگا دیں اور کھپا دیں تو ہمارے لیے کامیابی ہی کامیابی ہے۔ حضرت حمزہؓ نے بھی تو اپنی آنکھوں سے اسلام کا غلبہ نہیں دیکھا کہ وہ تو غزوۂ اُحد میں ہی شہید کر دیے گئے تھے۔ حضرت یاسر اور حضرت سُمیہؓ مکہ ہی میں شہید کر دیے گئے تھے‘ انہیں بھی اسلام کا غلبہ دیکھنا تو کیا مدینہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا۔ لیکن کیا‘ معاذ اللہ‘ یہ ناکام ٹھہرے؟ اسی طرح ہم نظامِ خلافت کی جدوجہد ہی میں اپنی جان دے دیں تو ہم کامیاب ہوں گے‘ بشرطیکہ یہ یقین رہے کہ نظامِ خلافت کا قیام ہو کر رہے گا — حضورﷺ کا مقصدِ بعثت دین کا غلبہ تھا‘ جسے قرآن حکیم میں تین بار اِن الفاظ میں بیان فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳، الفتح:۲۸، الصف:۹)

’’وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو ہدایتِ تامہ (قرآن حکیم) اور دینِ حق کے ساتھ‘ تاکہ اسے غالب کر دے کُل کے کُل دین پر۔‘‘

اور ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ......﴾ (سبا:۲۸)

’’(اے نبیﷺ!) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر......‘‘

ان دونوں باتوں کو باہم جوڑنے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اگر پورے عالمِ ارضی پر دین کا غلبہ نہ ہو تو حضورﷺ کا مقصدِ بعثت شرمندۂ تکمیل رہتا ہے۔ یہی بات علامہ اقبال نے کہی تھی ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

پورا کُرۂ ارضی جب تک نورِ توحید سے جگمگا نہیں جاتا اُس وقت تک محمد ﷺ کا مشن جاری رہے گا۔ جیسے کبھی میدانِ بدر اور دامنِ اُحد میں حق و باطل کی معرکہ آرائی تھی ویسے ہی حق و باطل کا معرکہ آج بھی جاری ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے بصیرت چاہیے' بصارت چاہیے۔ بقول اقبال ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

ہاں' ایک وقت آ کر رہے گا جب شرارِ بولہبی بجھ جائے گا اور چراغِ مصطفوی ﷺ سے چہار دانگِ عالم منور ہو جائے گا۔

موجودہ عالمی حالات اور اسلام کا مستقبل

یہ تو ماضی اور مستقبل کی بات ہوئی' اب کچھ زمانۂ حال کی بات بھی ہو جائے۔ زمانۂ حال کا معاملہ بہت مایوس کن ہے۔ اس وقت دنیا کی کل آبادی ۶ ارب کے قریب ہے جس میں سوا ارب کے قریب مسلمان ہیں۔ اٹھارہ کروڑ مسلمان صرف بھارت میں ہیں۔ تیل کی دولت بھی مسلمانوں کے پاس ہے' افرادی قوت بھی وافر مقدار میں مہیا ہے' زرعی رقبہ بھی ہے' لیکن اس سب کے باوجود عزت نام کی کوئی شے مسلمانوں کو حاصل نہیں ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کی کوئی حیثیت نہیں' ہماری قسمت کے فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں' ہماری منصوبہ بندی کسی اور جگہ تشکیل پاتی ہے' ہمارا بجٹ کوئی اور طاقت منظور کرتی ہے' اشیاءِ صرف کے نرخوں کا تعیّن بھی باہر ہی سے ہوتا ہے۔ غرضیکہ نہایت ہی تشویش ناک اور مایوس کن صورتِ حال کا سامنا ہے۔ ان حالات میں مَیں کون ہوتا ہوں آپ حضرات کو خوشخبری سنانے والا؟ لیکن میں تو نقل کرنے والا ہوں' میں تو حضور ﷺ کی بات آپ کو سنا رہا ہوں' جو میرے لیے بھی قطعی الثبوت ہے اور آپ کے لیے بھی قابلِ یقین ہی نہیں واجب یقین ہے۔ تو اگرچہ اس وقت کے حالات کے اعتبار سے تو معاملہ بہت مختلف ہے کہ نہ تو ہماری کہیں عزت ہے اور نہ ہی ہمیں حقیقی آزادی حاصل ہے' لیکن ایسے میں مَیں آپ کو عالمی سطح پر نظامِ خلافت کے قیام کی خبر دے رہا ہوں اور اس وقت

دے رہا ہوں جب ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا دور آ چکا ہے۔ ظلم کی آندھی اٹھ رہی ہے۔ یہ ''نیو ورلڈ آرڈر'' درحقیقت ''جیو ورلڈ آرڈر'' ہے۔ امریکی شہر نیویارک کو خود وہاں کے لوگ بھی ''جیویارک'' کہتے ہیں اور علامہ اقبال مرحوم نے اس صدی کے آغاز میں انگلستان اور جرمنی کے مشاہدے کے بعد فرمایا تھا کہ ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے''۔ یہ ایک صدی قبل کی بات ہے لیکن آج پوری دنیا جانتی ہے کہ دنیا میں ایک ہی سپریم طاقت باقی رہ گئی ہے جسے امریکہ کہا جاتا ہے۔ سوویت یونین کا وجود تک ختم ہو چکا ہے' اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے روس اور امریکہ دونوں کے مابین محاذ آرائی کا معاملہ چل رہا تھا' مگر اب تو میدان میں صرف ایک ہی طاقت ہے جس پر یہود کا شکنجہ کسا ہوا ہے۔

۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام عمل میں آیا تھا۔ یہود کا یہ پختہ اور اٹل منصوبہ ہے کہ ۱۹۹۸ء تک عظیم تر اسرائیل وجود میں آ جائے گا۔ یہودی اکابرین کے منشور میں یہ سب نقشے' یہ سب تفصیلات درج ہیں۔ ان کی منصوبہ بندی کے پورے پچاس برس کے بعد اسرائیل قائم ہو گیا تھا اور مزید پچاس برس بعد عظیم تر اسرائیل کا قیام ان کے منصوبے کا حصہ ہے۔ میڈرڈ امن کانفرنس سے واپس آ کر اسرائیلی وزیر اعظم شمیر نے کہا کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں عربوں کے جو علاقے اسرائیلی قبضے میں آئے تھے کیا وہ ہم خالی کر دیں؟ نہیں' ہمیں تو اپنی سرحدیں مزید بڑھانا ہیں' اس لیے کہ پورا شام ہمارا ہے' پورا عراق ہمارا ہے' پورا لبنان ہمارا ہے' پورا مصر ہمارا ہے' ترکی کا مشرقی علاقہ ہمارا ہے' شمالی حجاز کا علاقہ بھی ہمارا ہے اور ان علاقوں میں مدینہ منورہ بھی شامل ہے۔ ان علاقوں پر مشتمل عظیم تر اسرائیل کا نقشہ اسرائیلی پارلیمنٹ کے باہر آویزاں ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ آج دنیا کی کوئی طاقت اسرائیل کے راستے کا روڑا بنتی نظر نہیں آتی۔ اس صورت حال کی خبر بھی حضور ﷺ نے امت کو دے رکھی ہے کہ یہود کی باسی کڑھی میں ایک دَور میں پھر اُبال آئے گا جب دجالِ اکبر کی صورت میں یہود کے لیڈر کا ظہور ہو گا۔ یہی ''المسیح الدجال'' ہو گا جس کی حضور ﷺ نے خبر دی ہے اور اس سے حضور ﷺ نے خود پناہ مانگی ہے: ((اَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ)) یعنی اے اللہ! میں مسیح دجال کے فتنے سے

تیری پناہ مانگتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ’’مسیح دجال کے فتنے سے تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی پناہ مانگی اور اپنی اپنی امتوں کو بھی اس فتنے سے پناہ مانگتے رہنے کی تلقین فرمائی‘‘۔ خلیج کی جنگ کو صدام حسین نے ’’اُمّ المحارب‘‘ کہا تھا اور صحیح کہا تھا۔ اس جنگ میں ایک عارضی سا تعطل پڑ گیا ہے۔ دجالِ اکبر کے ظہور کا زمانہ آنے والا ہے جو اُمت مسلمہ کے لیے سب سے بڑی آزمائش ہوگا۔ بہر حال جو ذلت و مسکنت یہود کا مقدر تھی وہ آج امت مسلمہ پر مسلط ہے' اس لیے کہ ہم نے خود بھی وہی کچھ کیا ہے جو یہود کا چلن تھا۔ ہم نے دین سے غداری کی' بے وفائی کی جبکہ فتح و نصرت کا وعدہ تو وفا سے مشروط ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا' لوح و قلم تیرے ہیں!

اُمّتِ مُسلمہ میں سب سے بڑے مجرم خود اہل عرب ہیں' اس لیے کہ انہی میں سے محمدؐ رسول اللہ ﷺ تھے اور انہی کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب نازل فرمائی' لیکن پھر بھی ان لوگوں نے اللہ کے دین سے روگردانی اختیار کر لی اور یوں اللہ کی سنت ثابتہ ان پر صادق آ چکی کہ ﴿وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا يَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَيۡرَكُمۡ﴾ (محمد:۳۸) یعنی اگر تم روگردانی اختیار کر لو گے تو ہم تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو لے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر سات سو برس پہلے اُس وقت عمل ہو چکا ہے جب اُمّتِ مُسلمہ کی قیادت عربوں سے سلب کر لی گئی اور وحشی تاتاری ہر طرف مسلمانوں کا خون بہانے لگے۔ اس صورتِ حال پر شیخ سعدیؒ نے کہا تھا۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
برزوالِ مُلکِ مستعصم امیر المؤمنیں!

لیکن عربوں کے زوال کے بعد اللہ تعالیٰ نے خود تاتاریوں کو اسلام کی دولت سے فیض یاب کر دیا اور وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

عربوں کی پیٹھ پر عذابِ خداوندی کا پہلا کوڑا تو کب کا برس چکا' اب ان پر عذاب کی آخری قسط بھی آ چکی ہے اور تمام عرب ممالک پوری طرح عذابِ خداوندی کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ البتہ غیر عرب اقوام میں سب سے بڑے مجرم ہم پاکستانی ہیں کہ ہم نے اسلام کے نام پر ملک حاصل کیا تھا۔ ہم نے ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا اِلٰہ اِلا اللہ!'' کے نعرے لگائے تھے' لیکن ۵۳ برس کا عرصہ گزرنے کے باوجود اسلام کہیں نظر نہیں آتا۔ جو اسلام پہلے موجود تھا اب تو ہم اس سے بھی بڑے دُور جا چکے ہیں۔ انگریزی تہذیب و تمدن جس قدر آج ہمارے ہاں رواج پا چکے ہیں' ۱۹۴۷ء سے پہلے تو یہ حال نہ تھا۔ اُس وقت چند اونچے گھرانوں کا یہ چلن تھا' مگر آج پوری قوم اس تہذیب میں رنگی جا چکی ہے۔ اس اعتبار سے ہمارا حال بہت دگرگوں ہے' مگر مستقبل کے حوالے سے حضور ﷺ کی یہ پیشین گوئیاں موجود ہیں' جن کے مطابق ایک بہت بڑے قائد کی حیثیت سے حضرت مہدیؒ آئیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کا نام میرے نام پر ہوگا اور ان کی والدہ کا نام میری والدہ کے نام پر ہوگا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا اور حضرت مسیحؑ ہی مقامِ ''لُد'' پر دجال کو قتل کر دیں گے۔ آج یہی ''لُد'' لڈا (Lydda) کے نام سے اسرائیل کا ایک بڑا فوجی اڈہ ہے۔ اسی جگہ سے دجالِ اکبر بھاگنے کی کوشش میں ہوگا جب حضرت مسیح علیہ السلام اسے پکڑ کر قتل کر دیں گے۔ یہی وہ وقت ہوگا جب یہود کا قلع قمع ہوگا' ان کا ایک ایک بچہ قتل ہوگا۔ یہ وہ وقت ہوگا جب ایک طرف حضرت مسیحؑ کی شکل میں آسمان سے نصرت آئے گی اور دوسری جانب مشرق کی طرف سے مدد آئے گی۔ مشرق وہی علاقہ ہے جس میں ہم آباد ہیں۔ حدیث میں اسی علاقے کو خراسان سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ خراسان میں آج کا پورا افغانستان شامل ہے اور قدیم زمانے کے خراسان میں پشاور تک کا علاقہ بھی شامل ہے۔ اسی علاقے سے افواج کی صورت میں عَلَم بردار گروہ یروشلم پہنچیں گے اور یہود کا مقابلہ کریں گے۔

اس وقت دنیا میں یہود کا جو اثر و رسوخ اور غلبہ نظر آ رہا ہے اس کی حیثیت عارضی ہے۔ جس طرح بجھنے سے پہلے چراغ آخری دفعہ بھڑکتا ہے' یہود کا یہ اقتدار' ان کا یہ

عروج بجھتی ہوئی شمع کی آخری بھڑک کی مانند ہوگا۔ اس کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن یہود کی بجھتی ہوئی شمع کی آخری بھڑک سے جس طرح مسلمانوں کو مصائب و آلام کا سامنا ہوگا اور جو سزا ملے گی اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج دنیا کے حالات بہت ہی تیز رفتاری سے بدل رہے ہیں۔ خلیج کی جنگ ان تمام حالات و واقعات کا سلسلۂ آغاز ہے۔

نظامِ خلافت اور اس کے خدوخال

ان حالات میں ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ نظامِ خلافت کیا تھا جو محمدِ عربی ﷺ کے ذریعے قائم ہوا؟ ہم صرف لفظ ''خلافت'' ہی کی تکرار کرتے رہیں اور نظامِ خلافت کی وضاحت نہ ہو تو ظاہر بات ہے کہ معاملہ آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ ہمیں دنیا کے سامنے واضح کرنا ہوگا کہ وہ نظامِ خلافت ہے کیا جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ پھر اس میں روحِ عصر کے تقاضوں کو بھی شامل کرنا ہوگا' اس لیے کہ حالات میں بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ اب جہاں یہ ضروری ہے کہ روحِ دین برقرار رہے اور روحِ خلافت بھی قائم رہے' وہاں یہ لازم ہے کہ عصرِ حاضر کے تقاضے بھی اس کے اندر سمو دیے جائیں۔ میں اپنی اس بات کو ایک مثال کے حوالے سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ ایک دَور وہ تھا جب نوعِ انسانی بادشاہت کے علاوہ کسی اور طرزِ حکومت کو جانتی نہیں تھی تو اُس زمانے میں خلافت بھی بادشاہت ہی کی شکل میں تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ ہی تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ﴾ (صٓ:۲۶) —— لیکن حضور ﷺ کے زمانے میں یہ خلافت مسلمانوں کی ایک مشترکہ متاع بن گئی' اسے اجتماعی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اب مسلمانوں کو خود اپنے میں سے کسی فرد کو خلیفہ چننا ہے۔ اب خلافت نہ نسلی بنیادوں پر قائم ہوگی اور نہ ہی وراثت میں منتقل ہوگی۔ بنو اُمیہ اور بنو عباس کے زمانے میں حکومت کا معاملہ جب نسل اور وراثت کے حوالے سے طے ہونے لگا تو یہ نظامِ خلافت نہ رہا' بلکہ ملوکیت میں تبدیل ہو گیا۔

اسی طرح عثمانی خلافت کو بھی ملوکیت ہی کا عہدِ حکومت کہا جائے گا۔ چنانچہ اگر ہم دنیا میں پھر سے خلافت کا نظام قائم کرنے چلے ہیں تو اس کی وضاحت ضروری ہے کہ اس کے اصول کیا ہوں گے۔ اگرچہ اس پہلو سے اس میں بعض علمی باتیں بھی آتی ہیں' پھر بھی ہمیں ان سب باتوں کو سمجھنا ہے تاکہ پہلے خود ہمارے' ہمارے ساتھیوں اور احباب کے ذہن صاف اور واضح ہوں' تبھی ہم دوسرے لوگوں کے خدشات بھی دُور کر سکیں گے' تبھی چراغ سے چراغ روشن ہوگا۔ میں آج اپنی بات دس نکات کی شکل میں پیش کر رہا ہوں کہ خلافتِ راشدہ کا دَورِ اوّلین کیا تھا! اب اس نظام کی کیا شکل ہوگی؟

① اللہ کی حاکمیت اور قرآن وسنت کی بالادستی

سب سے پہلا نکتہ دراصل نظامِ خلافت کا اصل تقاضا ہے' یعنی یہ طے کر دیا جائے کہ حاکمیت کا اختیار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اس کے برعکس جمہوریت اس اعتبار سے ایک ملعون نظام ہے کہ اس میں حاکمیت کا اختیار عوام کو حاصل ہوتا ہے اور یہی چیز کفر ہے' شرک ہے' اس لیے کہ ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

اس سے پہلے جمہوریت کے ساتھ اسلام کا لاحقہ لگا کر ہم اسے ''اسلامی جمہوریت'' کہتے رہے ہیں' لیکن جمہوریت میں عوام کی حاکمیت کا بیج اتنا گہرا پڑا ہوا ہے کہ اسے نکالنے کی لاکھ کوشش کریں لیکن پھر بھی نہیں نکلتا۔ علامہ اقبال نے جمہوریت کے اسی تصور کو بتانِ آزری سے تعبیر کیا۔ اسلام میں اللہ کے علاوہ کسی کو حاکمیت کا اختیار حاصل نہیں اور ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو ''قراردادِ مقاصد'' کی صورت میں پاکستان کے آئین میں طے کر دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی جدوجہد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قراردادِ مقاصد کی منظوری کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی کو یہ دھمکی بھی دینا پڑی کہ اگر دستور ساز اسمبلی قراردادِ مقاصد کو منظور نہیں کرے گی تو میں اسمبلی سے باہر جا کر عوام سے کہوں گا کہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے ساتھ دھوکا کیا

ہے' یہ لوگ اسلام نہیں چاہتے' انہوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے دھوکہ بازی کے ذریعے مسلمانوں کے ووٹ حاصل کیے۔ اس دھمکی کے بعد دستور ساز اسمبلی سے قراردادِ مقاصد پاس ہوئی۔ اس قرارداد کو منظور کرانے کے لیے جماعت اسلامی نے بھی بڑی ہی منظم مہم چلائی جس کا پاکستان کے لوگوں نے ساتھ دیا تھا۔ جماعت اُس وقت تک ایک سیاسی جماعت نہیں تھی اور براہِ راست مدِمقابل کی حیثیت سے الیکشن کے میدان میں نہیں آئی تھی' اس لیے جماعت کی اس مہم کی پذیرائی کی گئی کہ یہ اسلام کی بات ہے' سیاست کی بات نہیں' یہ اقتدار کا کھیل نہیں ہے۔ بہرحال اس قرارداد کی منظوری میں جس کا جتنا ہاتھ ہے' جس کی جتنی کوشش ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر و ثواب سے نوازے۔ الحمدللہ اس قراردادِ مقاصد کی شکل میں ہمارے آئین میں اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی حاکمیت کی عملی صورت کیا ہو؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں عملاً تو موجود نہیں۔ اگرچہ وہ ہر جگہ موجود ہے لیکن درمیان میں غیب کا پردہ حائل ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نفاذ درحقیقت کتاب و سنت کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالادستی کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ دستور میں اگر کتاب و سنت کی بالادستی طے کردی جائے تو اس طرح اللہ کی حاکمیت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ مگر ہم نے اس پہلو سے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑی چالبازیاں کی ہیں' اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے اور اس کی سزائیں بھی ہمیں مل چکی ہیں اور مل رہی ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں اسی جرم کی سزا کے طور پر پاکستان دولخت ہوا' ہندو کے ہاتھوں ہمارے ایک لاکھ جوان قیدی بنے' لیکن پھر بھی ہم ہوش میں نہ آئے۔ غنیمت ہے کہ یہ خطہ ابھی باقی ہے۔ تاہم اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی سے ہم باز نہ آئے تو ہوسکتا ہے کہ یہ خطہ بھی مختلف حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ مشرقی پاکستان تو بنگلہ دیش بن کر ایک وحدت کی حیثیت سے موجود ہے' لیکن اگر خدانخواستہ اس مغربی حصے کو کچھ ہوا تو اس کے کئی ٹکڑے ہونے کا اندیشہ ہے۔ جب تک ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی دھوکے بازی بند نہیں کریں گے' بحیثیت قوم شدید خطرے کی زد میں ہی رہیں گے۔

یہ دھوکے بازی کیا ہے؟ ہم نے دستورِ پاکستان میں یہ دفعہ رکھی کہ ’’قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں ہو گی‘‘ لیکن اس دفعہ کو محض ’’راہنما اصول‘‘ (Directive Principle) کی حیثیت دی گئی نہ کہ ’’عملی ضابطہ‘‘ (Operative Clause) کی۔ گویا اصول کی حد تک کتاب وسنت کی بالادستی قبول ہے‘ مگر اس کی بنیاد پر عدالتوں میں کوئی معاملہ زیر بحث نہیں لایا جا سکتا تھا۔ ضیاء الحق مرحوم کے دَورِ اقتدار تک یہ دھوکے بازی چلتی رہی‘ تا آنکہ ضیاء الحق نے ایک قدم آگے بڑھایا اور وفاقی شرعی عدالت قائم کر دی‘ جسے یہ اختیار دیا گیا کہ یہ عدالت جس قانون کو کتاب وسنت کے منافی سمجھے اسے کالعدم قرار دے دے۔ لیکن وفاقی شرعی عدالت کے معاملے میں ایک اور پہلو سے بہت بڑا دھوکہ یہ کیا گیا کہ اسے دو ہتھکڑیاں اور دو بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ یعنی وہ نہ تو دستورِ پاکستان کے بارے میں اپنی رائے دے سکتی ہے اور نہ ہی عدالتی قوانین کا جائزہ لے سکتی ہے۔ پھر یہ کہ عدالت مالی قوانین کا جائزہ بھی نہیں لے سکتی اور حد یہ ہے کہ عائلی قوانین پر رائے دینے کی مجاز بھی نہیں۔ اس قدر پابندیاں اور جکڑ بندیاں لگا کر شرعی عدالت بنانے سے کیا کچھ حاصل ہو سکتا تھا؟ آج کے دَور میں مالیات اور اقتصادیات سب سے بڑی شے ہیں‘ لیکن ان میں بھی شریعت کا عمل دخل پسند نہیں کیا گیا۔ عائلی قوانین جو ہمارے تمدن کی جڑ اور بنیاد ہیں‘ وہ بھی شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار سے ابھی تک باہر ہیں۔ البتہ مالی قوانین کے ضمن میں دس سال کی جو پابندی عائد کی گئی تھی وہ مدت گزرنے کے بعد یہ ہتھکڑی از خود کھل گئی ہے۔ چنانچہ وفاقی شرعی عدالت نے ۲۲ مالی قوانین کو سودی اور خلافِ اسلام قرار دے کر حرام قرار دے دیا ہے اور حکومت کو چھ ماہ کی مہلت دی گئی ہے کہ اس عرصے میں متعلقہ قوانین کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تشکیل دے سکے۔

ہماری قومی اسمبلی نے تو وفاقی شرعی عدالت کے اختیارات محدود کرنے سے بھی بڑا دھوکہ کیا ہے۔ وہ یوں کہ ’’نفاذِ شریعت ایکٹ‘‘ بھی منظور کر لیا اور ساتھ ہی ہر قسم کے سودی کاروبار کو جاری رکھنے کی سند بھی عطا کر دی گئی۔ اس فیصلے سے گویا بحیثیت قوم ہم

نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ اعلانِ جنگ کر دیا۔ ہم تو حکمرانوں سے یہی کہہ سکتے ہیں کہ خدارا اللہ تعالیٰ کو دھوکہ مت دو۔ خدا کے لیے مسلمانوں کو دھوکہ مت دو۔ وزیراعظم نواز شریف نے نفاذِ شریعت ایکٹ کے اعلان کے ساتھ قوم سے دستور میں ضروری ترمیم کا وعدہ بھی کیا تھا‘ مگر یہ وعدہ وفا ہونے کی نوبت آج تک نہیں آ سکی ہے۔ جب تک دستور میں یہ ترمیم نہیں ہوتی کہ کتاب وسنت کو پاکستان کے دستور اور نظام وقوانین سب پر بالادستی حاصل ہوگی‘ اس وقت تک نفاذِ اسلام کی جانب نتیجہ خیز پیش رفت نہیں ہو سکتی۔ آئین میں کتاب وسنت کی بالادستی طے کر دی جائے تو یہ معاملہ اعلیٰ عدالتوں کے ذریعے طے ہوتا رہے گا کہ کون سا قانون یا ضابطہ خلافِ اسلام ہے اور کون سا نہیں۔ یہ اختیار اسمبلی کے ممبران کو بھی نہیں دیا جا سکتا‘ کیونکہ ان کی عظیم اکثریت اَن پڑھ ہوتی ہے‘ اور جو لوگ پڑھے لکھے ہیں‘ تعلیم یافتہ ہیں‘ وہ بھی مغربی تعلیم سے آراستہ ہیں‘ انہیں دین کا علم حاصل نہیں۔ چنانچہ یہ کام عدالت ہی کر سکتی ہے۔ وہاں علماء بھی اپنے دلائل پیش کریں‘ دانشور حضرات بھی اپنی بات رکھیں‘ اس لیے کہ عدالت کی فضا تو سیاسی جلسے سے بہت مختلف ہوتی ہے‘ عدالت اَن پڑھ لوگوں کی پارلیمنٹ نہیں ہوتی۔ ایک بزرگ جو اَب فوت ہو چکے ہیں‘ وہ ”پڑھے لکھے اَن پڑھ“ کی اصطلاح استعمال کیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ایک طرف ایم بی بی ایس کیا ہوا ہے یا پی ایچ ڈی کی ڈگری کا حامل ہے‘ لیکن دوسری طرف دین کا ایک حرف بھی نہیں پڑھا تو اس حوالے سے وہ جاہل مطلق ہے‘ جبکہ اسمبلی میں تو ”چٹے اَن پڑھ“ بھی ہوتے ہیں جو زمینداری اور وڈیرا شاہی کی وجہ سے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شریعت کے حلال وحرام کا فیصلہ ایسے لوگوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) خلیفہ کا براہِ راست انتخاب

خلافتِ راشدہ کے عہد میں خلافت کا منصب مسلمانوں کے باہمی مشورے سے پُر کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا خطبہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آپؓ کا یہ خطبہ مسند احمدؒ میں بھی موجود ہے اور اسے امام بخاریؒ نے بھی اپنی صحیح میں نقل کیا

ہے۔ ایک موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب یہ اطلاع ملی کہ کچھ لوگ اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں کہ اگر کسی وقت اچانک عمرؓ کا انتقال ہو جائے تو اس صورت میں ہم فوراً فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے تو حضرت عمرؓ نے اس حوالے سے مدینہ میں ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا: ''لوگو! میں تمہیں ان لوگوں کی سازش سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جو تمہیں تمہارے حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں' اس لیے کہ خلیفہ کا انتخاب مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہی ہو سکتا ہے۔ اگر خلیفہ کے منصب کے لیے کسی شخص کی اچانک بیعت کر لی گئی تو وہ بیعت' بیعت ہی نہیں ہو گی''۔ صحیح بخاری میں تو الفاظ یہ بھی ہیں کہ ''جس کی بیعت کی گئی نہ اس کی کوئی حیثیت ہو گی اور نہ بیعت کرنے والے کی بیعت کی'' —— ایسے سب کے سب لوگ نا اہل ہو جائیں گے۔ خلافت کا منصب اگر مِنْ غَیْرِ مَشْوَرَةِ الْمُسْلِمِیْن (مسلمانوں کے مشورے کے بغیر) طے ہوا ہو تو ایسا فعل خلافِ اسلام ہو گا۔

یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ اُس وقت آج کی طرح بیلٹ بکس نہ تھے' انتخابات کا باقاعدہ نظام بھی موجود نہ تھا' تاہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین ایک درجہ بندی قائم تھی۔ اصحابِ بدر بھی معین تھے' عشرہ مبشرہ بھی معلوم و معروف تھے اور بیعت رضوان کے حوالے سے اصحابِ شجرہ بھی موجود تھے۔ اب اس طرح کی درجہ بندی موجود نہیں ہے۔ اسی طرح وہاں قبائلی نظام رائج تھا اور اس نظام میں ایک ایک آدمی سے رائے نہیں لی جاتی تھی' لیکن آج تمام مسلمان ایک ہی حیثیت کے مالک ہیں۔ اب تو مسلمانوں کے باہمی مشورے کی ایک ہی شکل ہے کہ خلیفہ کے براہِ راست انتخاب کے لیے تمام مسلمان' مرد بھی اور عورتیں بھی' اپنا ووٹ استعمال کریں اور اکثریتی ووٹ حاصل کرنے والا شخص خلیفہ کے منصب کا اہل ہو۔ اگرچہ بعض حضرات کا یہ موقف بھی سامنے آیا ہے کہ ووٹ دینے کا حق صرف اہل تقویٰ کو حاصل ہونا چاہیے' ووٹ دینے والا کم از کم نماز کا تو پابند ہو' لیکن آج کے دَور میں اس طرح کی سب باتیں غلط ہیں' اس لیے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس بات کو ہمیشہ کے لیے طے کر دیا کہ ''اَلْمُسْلِمُ کُفُوٌ لِکُلِّ مُسْلِمٍ'' یعنی مسلم فاسق ہو یا

متقی ہو' دونوں کے قانونی حقوق یکساں ہوں گے۔ یہ بات جان لیجیے کہ اسلام کا قانون یہ ہے کہ تقویٰ اور فسق و فجور دونوں کا ثواب و عذاب آخرت سے متعلق ہے۔ اس دنیا میں سماجی سطح پر تمام مسلمان یکساں حیثیت کے حامل ہیں اور قانون کی سطح پر بھی تمام مسلمان باہم برابر ہیں۔ اس بات کو نہایت سادہ مثال سے سمجھئے! ایک باپ کے اگر دو بیٹے ہوں' جن میں سے ایک متقی ہو' تہجد گزار ہو اور دوسرا فاسق ہو اور نماز کے قریب بھی نہ پھٹکتا ہو' تب بھی دونوں کو وراثت میں ایک جیسا حصہ ملے گا۔ متقی کو زیادہ اور فاسق کو کم نہیں۔ اس بنیاد پر ووٹ کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہے۔ یہی روحِ عصر بھی ہے اور آج کے دَور کا تقاضا بھی۔

پورے ملک کی سطح پر خلیفہ کا براہِ راست انتخاب ہو گا۔ اس اصول کو اختیار کرنے سے چھوٹے اور علاقائی وڈیرے غیر مؤثر ہو جائیں گے۔ لوگ لازماً یہ دیکھیں گے کہ کون شخص خلیفہ کے منصب کی واقعی اہلیت رکھتا ہے۔ ہمارے عوام کے اندر شعور ہے' چاہے ان کی اکثریت کا طرزِ عمل فاسق و فاجر لوگوں سے ہی مشابہت کیوں نہ رکھتا ہو۔ عوام خوب جانتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے' لہٰذا اس طریق کار کے تحت اپنی رائے کسی اہل تر شخص کے حق ہی میں دیں گے۔ البتہ یہ اصول طے کرنا پڑے گا کہ جو لوگ انتخابات کے لیے آگے آئیں' یہ چاہے خلیفہ کے منصب کا انتخاب لڑ رہے ہوں یا مجلس ملی یعنی پارلیمنٹ کا' ہر دو صورتوں میں ان کے کردار و اخلاق کی پوری چھان بین ضروری ہو گی۔ اس لیے کہ ایسے لوگ حرام خوری کرنے والے نہ ہوں' بدکردار نہ ہوں تب ہی بات بنے گی۔ میرے خیال میں ہر ووٹر کے لیے اس طرح کی شرائط عائد کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس طرح سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور عوام الناس کو حق رائے دہی حاصل ہو جاتا ہے۔

③ مخلوط قومیت کی نفی اور غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ

خلافت کے نظام میں اگلی بات غیر مسلموں کی حیثیت سے متعلق ہے۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلم برابر کا شہری نہیں ہو سکتا' غیر مسلم ذمی ہو گا۔ ہمارے یہاں تو عجیب و غریب تماشے ہوتے رہے ہیں۔ ضیاء الحق نے مجلس شوریٰ بنائی تو اس میں مسلمان تو تھے

ہی' ان کے ساتھ ساتھ ہندو' عیسائی اور پارسی بھی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ کیا ایسے ایوان کو مجلس شوریٰ کا نام دیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! میں بھی غلطی سے اس شوریٰ کا رکن بن گیا تھا لیکن صرف دو مہینے کے بعد ہی میں نے اسے چھوڑ دیا۔ خلافت کے نظام میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ البتہ غیر مسلم رعایا کو ہر طرح کا تحفظ حاصل ہو گا۔ ان کی جان' عزت' آبرو اور مال کی حفاظت کی ذمہ دار اسلامی ریاست ہو گی اور اسی حوالے سے اسلامی ریاست کے غیر مسلم باشندوں کو ''ذمی'' کہا جاتا ہے۔ غیر مسلم رعایا کی جان بھی اتنی ہی محترم ہو گی جتنی کسی مسلمان کی محترم ہوتی ہے۔ ان کی عزت و آبرو بھی اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی مسلمان کی۔ ان کی جائیداد کی حفاظت کا اتنا ہی اہتمام ہو گا جتنا کسی مسلمان کی جائیداد کا اہتمام ہو گا۔ انہیں عقیدہ و عبادت کی مکمل آزادی حاصل رہے گی' ان کی عبادت گاہیں اتنی ہی مقدس اور محترم ہوں گی جتنی خود مسلمانوں کی مسجدیں سمجھی جاتی ہیں۔ انہیں اپنے مذہب کی تبلیغ اپنی آئندہ نسلوں اور اپنی ہم عقیدہ قوم میں کرنے کا حق حاصل ہو گا' البتہ یہ لوگ مسلمانوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکیں گے۔

پاکستان میں عیسائیت کو تیزی سے فروغ حاصل ہو رہا ہے اور اقلیتی رکن قومی اسمبلی جے سالک کے مطابق مسیحی آبادی ۷۵ لاکھ کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اگرچہ یہ اعداد و شمار کسی بھی طرح صحیح نہیں ہیں لیکن پھر بھی عیسائیت کو پاکستان میں فروغ تو دیا جا رہا ہے۔ پوری دنیا میں عیسائیت کے فروغ کے لیے چندے آتے ہیں۔ عیسائی مشنریوں کے سالانہ بجٹ بعض ممالک کے بجٹ کی رقوم سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ جیسے لکڑی کو دیمک اندر ہی اندر چٹ کر جاتی ہے ویسے ہی ہمارے معاشرے میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے لیکن اس کے باوجود قادیانیوں کی تبلیغ کا سلسلہ جاری ہے اور یہ سلسلہ پورے زور کے ساتھ اندر ہی اندر چل رہا ہے۔

اسلامی ریاست میں کوئی غیر مسلم رعایا برابر کے شہری کی حیثیت نہیں رکھتی' لہٰذا خلیفہ کے انتخاب میں یہ لوگ رائے دینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ ایسے لوگ نہ تو مجلس شوریٰ کے رکن بن سکیں گے اور نہ اراکین شوریٰ کے انتخاب میں ووٹ دینے کے اہل ہوں

گے۔ تکنیکی نوعیت کی ملازمتوں میں ان لوگوں کے لیے راستہ کھلا ہوگا۔ چنانچہ طب کا شعبہ ہو یا انجینئرنگ کا میدان‘ ایسے شعبہ جات میں ان کے لیے گنجائش ہوگی‘ لیکن جہاں تک قانون سازی اور پالیسی سازی کا تعلق ہے اس میں کسی غیر مسلم کو شریک نہیں کیا جائے گا۔ یہی نظام خلافت راشدہ کے عہد میں رائج تھا اور اب بھی یہی اصول کارفرما ہوگا۔

ایسے لوگوں سے ﴿يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾(التوبة) کے مصداق جزیہ لیا جائے گا۔ ’’جزیہ‘‘ کوئی گالی نہیں ہے بلکہ قرآنی اصطلاح ہے۔ جزیہ کا لفظ جزا سے بنا ہے جبکہ ذمی ذمہ سے بنا ہے۔ میری اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے۔ خلافت راشدہ کے دَور میں جہادِ اسلامی کا فریضہ جاری تھا۔ اسی دَوران شام کا ایک شہر مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا تو متعلقہ حکام نے وہاں کے باشندوں سے جزیہ کی رقم وصول کر لی۔ جزیہ کی وصولی کے بعد ایسی صورتِ حال بن گئی کہ مسلمانوں کو یہ شہر چھوڑنا پڑ رہا تھا‘ دفاعی اقدام کے طور پر اسے خالی کرنا ضروری تھا۔ اس موقع پر اسلامی افواج کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے غیر مسلم رعایا کو بلایا اور ان کی پوری رقم یہ کہہ کر واپس کر دی کہ ہم نے آپ لوگوں سے آپ ہی کی حفاظت کے معاوضے کے طور پر ’’جزیہ‘‘ کی صورت میں رقم لی تھی‘ لیکن اب چونکہ ہمیں اس شہر کو چھوڑنا پڑ رہا ہے اور ہم آپ لوگوں کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لے سکتے لہٰذا جزیہ کی یہ رقم واپس کی جاتی ہے۔ اس موقع پر وہاں کی عیسائی آبادی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی کہ ایسے راست باز اور بااخلاق لوگ تو ہم نے آج تک دیکھے ہی نہیں۔ ہمارے حاکم تو ظالم تھے‘ لیکن مسلمانوں کی دیانت کا یہ عالم ہے کہ جزیہ کی رقم بھی واپس کر دی گئی ہے۔ اسلامی ریاست میں ہندو‘ عیسائی‘ قادیانی اور پارسی وغیرہ سب کو اپنی حفاظت کے عوض حکومت کو ایک ٹیکس ادا کرنا ہوگا‘ اس ٹیکس کا نام ’’جزیہ‘‘ ہے۔ اب ہمیں اپنے اندر ایسی جرأت پیدا کرنا ہوگی کہ اس طرح کی باتیں ہم ڈنکے کی چوٹ پر کہہ سکیں اور روایتی معذرت خواہانہ اندازِ فکر کو ترک کر دیں۔

④ نظامِ صلوٰۃ کا قیام

چوتھی چیز نماز کے نظام کا قیام ہے۔ آپ کہیں گے کہ نماز کا نظام تو اب بھی قائم ہے‘

تو حقیقت یہ ہے کہ اس وقت نماز کا نظام قائم نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں دوئی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود مسجد نبویؐ کے خطیب اور امام بھی تھے اور یہی معاملہ خلفاءِ راشدین کا ہے۔ اسی طرح درجہ بدرجہ تمام عامل (گورنر' کمشنر وغیرہ) نمازِ جمعہ کی امامت کا فریضہ بھی ادا کرتے تھے اور مملکت کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔ حنفی فقہ کے مطابق حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی شخص جمعہ نہیں پڑھا سکتا۔ نمازِ پنجگانہ کا اہتمام عام مساجد میں ہر کوئی کر سکتا ہے اور پڑھا بھی سکتا ہے' مگر جامع مساجد کا انتظام حکومت کی اجازت اور نظم کے تحت ہی قائم ہو سکتا ہے۔ آج کی طرح کا معاملہ نہیں کہ چلتا پھرتا کوئی آدمی لا کر مصلّے پر کھڑا کر دیا اور اسے امام کہہ دیا۔ ایسے تصورِ دین و مذہب پر علامہ اقبال نے پھبتی چست کی تھی ؎

قوم کیا چیز ہے' قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام!

ان کی جو عزت معاشرے میں ہے وہ ہم سب کو معلوم ہے۔ دیہات کی مسجد کا مولوی زمیندار کے ''کمّی'' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور شہروں کے اندر مولوی حضرات انتظامیہ کمیٹی ہی کے دست نگر ہوتے ہیں۔ ہاں چالاک اور ذہین و فطین لوگوں کے اس حوالے سے بڑے ٹھاٹھ کے دھندے ضرور چل رہے ہیں۔ تاہم ان ائمہ اور خطباء میں بہت سے متقی' پرہیزگار اور خدا ترس بھی ہیں۔ نظامِ خلافت کے تحت پوری ریاست کی سطح پر نماز کا نظام قائم ہو گا اور خلیفۂ وقت دار الخلافہ کی جامع مسجد کا خطیب و امام خود ہو گا۔ صوبائی صدر مقامات اور درجہ بدرجہ دیگر جگہوں پر بھی اسی طریقے سے نماز کا اہتمام ہو گا۔

⑤ زکوٰۃ کی کامل تنفیذ

زکوٰۃ کے شرعی فریضے کو بھی ہم نے بہت زیادہ بدنام کر رکھا ہے اور بدقسمتی سے ضیاء الحق مرحوم کے زمانے میں اس ضمن میں جو قدم اٹھایا گیا اس نے زکوٰۃ کو مزید بدنام کر دیا۔ زکوٰۃ کا اصل مقصد ہے کیا؟ اسے سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ زکوٰۃ کا اسلام کے

معاشی شعبے میں بہت اہم حصہ ہے۔ ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت اسلامی ریاست کی اوّلین ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص بھوکا رہتا ہے تو اس کی ذمہ داری ریاست پر عائد ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ ''دریائے فرات کے کنارے پر کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے دن اس کی جواب دہی عمر (رضی اللہ عنہ) سے ہوگی''۔ معلوم ہوا کہ ہر شہری کے لیے روٹی' کپڑا' مکان' لباس اور تعلیم جیسی بنیادی ضروریات کی فراہمی بھی ریاست کے ذمے ہے۔ کبھی ذوالفقار علی بھٹو نے بھی روٹی' کپڑے اور مکان کا نعرہ لگایا تھا' لیکن وہ محض ایک نعرہ ہی تھا۔ سیاسی اختلافات کی وجہ سے اس نعرے کے خلاف ۳۱۳ علماء کے فتوے بھی جاری ہو گئے تھے۔ جاننا چاہیے کہ روٹی' کپڑا اور مکان کا نعرہ کافرانہ نعرہ نہیں ہے' بلکہ یہ چیزیں انسان کی بنیادی ضروریات میں داخل ہیں اور ان کا حصول ہر شہری کا حق ہے۔ اگر آپ اسلام کا نظامِ خلافت قائم کرنے کی بات کرتے ہیں تو یہ ذمہ داری آپ کو نبھانی پڑے گی کہ کوئی شہری روٹی' کپڑے اور مکان جیسی بنیادی ضروریات سے محروم رہا تو خلافت کا حق ادا نہیں ہوگا۔ قول و عمل میں تضاد جلد ہی لوگوں کے سامنے آجاتا ہے۔ چنانچہ بھٹو کی وڈیرہ شاہی جلد ہی سامنے آگئی۔ اسے تاریخ میں ایک بہت بڑا موقع حاصل تھا۔ وہ چاہتا تو جاگیرداری نظام کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ دین کے ساتھ اس کا کوئی عملی تعلق نہیں تھا لیکن وہ اس ملک کا ماؤزے تنگ تو بن ہی سکتا تھا' مگر وہ اپنی جاگیردارانہ کھال سے باہر نہیں نکل سکا۔ تاہم جو نعرہ اس نے لگایا وہ صحیح تھا' تاہم ''كَلِمَةُ حَقٍّ أُرِيْدَ بِهِ الْبَاطِل'' کے مصداق اس نعرے سے وہ جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا وہ کوئی اور تھا۔

سوال یہ ہے کہ ہر شہری کی بنیادی ضروریات پوری کرنا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے تو اسلامی ریاست یہ سب کچھ کیسے فراہم کرے گی؟ نظامِ خلافت ہر شہری کو بنیادی ضروریات کہاں سے فراہم کرے گا؟ یہ سب کچھ زکوٰۃ کی مدد سے پورا ہوگا۔ بھٹو نے روٹی' کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا اور اس تصور کو بدنام کر دیا' اسی طرح ضیاء الحق نے زکوٰۃ کو بدنام کر دیا کہ صرف بینک ڈیپازٹ میں سے زکوٰۃ کاٹی جائے گی۔ یعنی سود میں

سے زکوٰۃ کاٹ لو' نجاست میں سے نجاست کو منہا کرلو' اس لیے کہ بینک ڈیپازٹ پر لوگوں کو سود ملتا ہے اور یہی سود سب سے بڑی نجاست اور گندگی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی فضلہ بھی اس قدر گندگی کا حامل نہیں ہے جس قدر گندگی کا حامل سود ہے۔ جتنا بڑا جرم اور گناہ سود ہے اتنا بڑا دوسرا کوئی جرم نہیں' اس لیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءًا اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ)) (ابن ماجه) یعنی سود کے گناہ کے ستر حصے ہیں اور اس کا ہلکاترین حصہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کا ارتکاب کرے۔ تو اس غلاظت میں سے آپ نے ڈھائی فیصد شرح سے نجاست منہا کرلی اور اسے زکوٰۃ کا نام دے دیا تو کیا زکوٰۃ کا نظام قائم ہوگیا؟ حالانکہ بعض علماء کے نزدیک بینک ڈیپازٹ اموالِ باطنہ کی ذیل میں آتا ہے اور اموالِ باطنہ پر حکومت جبراً زکوٰۃ وصول نہیں کرسکتی۔ یہی موقف مولانا مفتی محمود کا تھا اور اموالِ باطنہ اور اموالِ ظاہرہ کے مسئلے پر بحث وتمحیص کے دَوران ہی مفتی صاحب کراچی میں قائم بنوری ٹاؤن کے مدرسے ہی میں انتقال کرگئے۔

حکومت اموالِ ظاہرہ پر جبراً زکوٰۃ وصول کرسکتی ہے جس میں مالِ تجارت سرفہرست ہے اور مالِ تجارت کی کُل مالیت پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے نہ کہ منافع پر۔ کاروبار میں نفع ہو یا نقصان اس سے کوئی بحث نہیں' حاضر مال پر زکوٰۃ ادا کرنا پڑے گی۔ اسی طرح کارخانوں اور فیکٹریوں کا معاملہ ہے۔ کارخانوں کی زمین' ان کی عمارت' ان کی مشینری' کارخانے کے اوزار اور آلات سب زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے' لیکن کارخانے میں تیار مال اور خام مال دونوں کی مالیت کو جمع کرکے ڈھائی فی صد کے حساب سے زکوٰۃ وصول کرلی جائے گی۔ زکوٰۃ کے اس نظام سے اس مد میں اس قدر روپیہ جمع ہوجائے گا کہ ریاست ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کا ذمہ لے سکتی ہے۔ اور وہ وقت بھی آسکتا ہے جب لوگ اپنے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ لیے لیے پھریں گے لیکن اسے لینے والا کوئی نہ ہوگا جیسے خلافت راشدہ کے دَور میں ہوا تھا۔ آج دنیا میں کافروں نے یہ سب کچھ کر دکھایا ہے کہ وہاں ویلفیئر کا نظام بہت ہی مضبوط بنیادوں پر استوار ہے جو ہر

بے روزگار، معذور اور مجبور شہری کی کفالت کا ضامن ہے۔ یہاں بھی ہر صاحبِ نصاب مسلمان زکوٰۃ دینے کے لیے تیار ہے لیکن آپ انکم ٹیکس کی لعنت کا خاتمہ تو کریں، دوسرے لعنتی قسم کے ٹیکس بھی ختم کر دیں۔ نظامِ خلافت کے تحت زکوٰۃ کا جو نظام قائم ہوگا اس میں ان تمام ٹیکسوں سے لوگوں کو نجات حاصل ہو جائے گی۔ انکم ٹیکس کے نظام نے ہر کاروباری آدمی کو جھوٹا اور بے ایمان بنا دیا ہے، اس لیے کہ اسے غلط گوشوارہ داخل کرنا پڑتا ہے، ورنہ کاروبار کی بساط تہہ کرنا پڑتی ہے۔ آدمی جب ایک دفعہ کسی معاملے میں جھوٹ بولتا ہے، چاہے مجبوراً ہی سہی، پھر جھوٹ اس کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور ہر معاملے میں جھوٹ کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے۔

⑥ سود کا کامل انسداد

نظامِ خلافت میں سود کے کامل انسداد کے ذریعے معیشت کی تطہیر کی جائے گی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سود کو بھی چھوڑ دو اور جس چیز میں سود کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو، اسے بھی چھوڑ دو۔ دورِ ملوکیت میں بہت سی غلط چیزوں کے جواز کا فتویٰ دے دیا گیا تھا، جیسے ادھار مال کی فروخت پر زائد بھاؤ لگنا جائز سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ سود ہی کی شکل ہے۔ اگر یہ سود نہیں تو سود اور کس بلا کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے فرد کو ایک سو روپیہ قرض دے اور دس روپے کا اضافہ مانگے تو یہ سود ہے، لیکن اگر سو روپے کی کوئی شے ادھار بیچے اور اس کے ۱۱۰ روپے وصول کرے تو یہ سود نہیں تو اور کیا ہے؟ سینیٹر حافظ حسین احمد کا بیان آپ لوگوں نے بھی اخبارات میں پڑھا ہوگا جس میں انہوں نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کی وجہ سے اب حکومت سود ہی کو سندِ جواز عطا کرنے کی کوشش کرے گی۔ یعنی بیع موجل اور بیع مرابحہ کی آڑ میں سود کو جائز قرار دلوانے کی کوشش ہوگی۔ اس موضوع پر مفتی سیاح الدین کاکا خیل کا تفصیلی مضمون ''حکمت قرآن'' کے ماہ جنوری ۱۹۹۲ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، تفصیل کے طالب حضرات کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(7) جاگیرداری نظام کا خاتمہ

ساتویں بات جاگیرداری کا سدِ باب ہے۔ میری گفتگو میں بار بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس سے کچھ تکلیف بھی محسوس ہوتی ہو کہ انہیں ہر معاملے میں عمرؓ ہی نظر آتے ہیں۔ اس کی بھی ایک وجہ ہے' اور وہ یہ کہ اسلامی نظامِ خلافت کی برکات پوری طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہی ظاہر ہوئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں انقلابی جدوجہد کا مرحلہ سر کیا جا رہا تھا' ہر طرف جہاد و قتال کے معرکے برپا تھے' جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہر چہار طرف سے فتنہ پرور عناصر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ لوگ مانعینِ زکوٰۃ کی شکل میں بھی سامنے آئے اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کی صورت میں بھی ظاہر ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کا مختصر عہدِ حکومت ان سازشوں کو ختم کرنے ہی میں ختم ہو گیا۔ خلافتِ راشدہ کے نظام کا پھول پوری طرح دورِ فاروقیؓ میں کھلا اور حضرت عثمانؓ کی خلافت کے پہلے دس برس بھی اسی شان و شوکت کے حامل تھے جس میں خلافتِ راشدہ کی برکات اپنے عروج پر نظر آتی تھیں۔ چنانچہ جاگیرداری نظام کے خاتمہ کے ضمن میں بھی حضرت عمرؓ کا اجتہاد فیصلہ کن امر بن کر سامنے آتا ہے۔ عہدِ فاروقیؓ میں مسلمان افواج نے عراق' مصر اور شام جیسے علاقے بھی فتح کر لیے تو مجاہدین نے حسبِ دستور مفتوحہ زمینوں کی تقسیم کا مطالبہ کیا کہ یہ اراضی مالِ غنیمت ہے۔ غنیمت کے مال کی تقسیم کا یہ قانون ہے کہ پانچواں حصہ ریاست یعنی بیت المال کا ہوتا ہے اور باقی مجاہدین میں تقسیم ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مفتوحہ زمینوں کا فیصلہ شوریٰ کے سامنے رکھا۔ بڑی طویل بحث و تمحیص اور ردّ و قدح کے بعد طے ہوا کہ مفتوحہ اراضی پر مالِ غنیمت کا قانون لاگو نہیں ہوگا بلکہ اس پر مالِ فے کے مصارف کا اطلاق ہوگا۔ اس بنا پر تمام تر اراضی بیت المال کی ملکیت قرار پائیں اور ان کا خراج براہِ راست بیت المال میں پہنچنے لگا اور یہی خراج تمام مسلمانوں کی اجتماعی بہبود پر خرچ ہوتا رہا۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اگر اُس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ اراضی مجاہدین میں تقسیم کر دیتے تو بدترین قسم کا جاگیردارانہ نظام لازماً قائم ہو جاتا۔

جس طرح زکوٰۃ کے ضمن میں مَیں نے آپ حضرات کے سامنے اموالِ ظاہرہ اور اموالِ باطنہ کی دو تقسیمیں رکھی ہیں ویسے ہی اراضی کے ضمن میں عشری اراضی اور خراجی اراضی کی دو اقسام ہیں۔ جو علاقے کسی بھی وقت مسلمانوں نے بزورِ شمشیر فتح کیے ہوں ان کی زمینیں قیامت تک کے لیے خراجی قرار پاتی ہیں۔ پاکستان کی اکثر و بیشتر اراضی بھی خراجی ہیں۔ پاکستان کی زمینیں کسی شخص کی ملکیت نہیں ہیں' کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہیں۔ یہ جاگیریں انگریز حکمرانوں نے اپنے حواریوں اور کاسہ لیسوں کو مسلمانوں سے غداری کے عوض انعام میں دی تھیں' لہٰذا جاگیرداروں اور زمین داروں کا حقِ ملکیت از خود ساقط ہو جاتا ہے۔ نظامِ خلافت میں ہمیں ایک نیا بندوبست اراضی تشکیل دینا ہوگا تاکہ زمین کے سینے کو چیرنے والے اور اس میں اپنا خونِ جگر دینے والے کاشتکار کو بھی اس کی محنت کا معاوضہ مل سکے! یہ کاشتکار' یہ کسان' یہ ہاری سب کے سب حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ کبھی کمیونزم کے سرخ سویرے کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی کوئی دھوکہ باز کوئی اور سبز باغ دکھا کر انہیں اپنے پیچھے لگا لیتا ہے۔ اس معاملے میں بھی اصل جرم ہمارا ہے کہ اسلام نے جو حل دیا ہے اسے ہم اختیار نہیں کرتے' لہٰذا یہ لوگ پھر چار و ناچار کسی دوسرے "ازم" کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بہرحال جاگیرداری کا سدِ باب حضرت عمرؓ نے اپنی بے پناہ بصیرت کی بنا پر کر دیا تھا اور آج بھی اسی اجتہاد کو بنیاد بنا کر ہم موجودہ زمینداری نظام کو ختم کر سکتے ہیں۔

(۸) شراب اور جوئے پر پابندی

نظامِ خلافت میں شراب اور جوئے پر مکمل پابندی عائد ہوگی کہ یہ چیزیں ﴿رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ (المائدۃ: ۹۰) کے قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ لاٹری سیف گیم ریفل کے نام سے ہو یا فاطمید ریفل ٹکٹ کے نام سے' یہ سب جوا ہے' اور شیطانی دھندہ ہے۔ لاٹری کی شکل میں جوئے کی یہ لعنت بھی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے جس سے ہمیں چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ انگریز جس طرح سود کی لعنت کو ہمارے گلے کا ہار بنا گیا تھا ویسی ہی خباثت جوئے کی شکل میں بھی چھوڑ گیا ہے۔

شراب اور جوئے کو قرآن مجید میں ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس لیے کہ یہ دونوں اشیاء انسانوں کو محنت سے دور بھگا دیتی ہیں۔ شراب کے نشے میں دُھت انسان حقائق کا سامنے کرنے کی بجائے ان سے گریز کی راہ اختیار کرتا ہے اور جوا محنت کی بجائے داؤ کھیلنے کی ترغیب ہی کا دوسرا نام ہے۔ دراصل یہ دونوں چیزیں انسانی شرافت اور وقار کے منافی ہیں۔ حقائق کا دلیری کے ساتھ سامنا کرنا ہی اصل مردانگی ہے اور محنت ہی انسان کا اصل زیور ہے۔

⑨ مکمل سماجی اور قانونی مساوات

نظامِ خلافت میں کامل انسانی مساوات کا تصور کارفرما ہوگا۔ تمام انسان برابر سمجھے جائیں گے، نہ کوئی اونچا ہوگا اور نہ کوئی نیچا۔ اسلامی معاشرے میں کوئی سید اونچا اور کوئی مصلّی نیچا نہیں۔ ایسے تمام تصورات کو ختم کرنا ہوگا اور ان کی جڑیں کھودنا ہوں گی، اس لیے کہ اسلام میں اونچ نیچ کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو سیدنا بلال کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

اسی طرح قانون کی نظر میں سب لوگ برابر ہوں گے۔ اسلام کے عدالتی نظام میں یہ تصور موجود نہیں ہے کہ سربراہِ مملکت یا خلیفۂ وقت عدالت میں حاضری سے مستثنیٰ ہے۔ یہ تو خیر اتنی انہونی بات نہیں ہے، لیکن نظامِ خلافت میں دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ مطلوبہ گواہوں کی عدم دستیابی کے باعث خود خلیفۂ وقت کا مقدمہ عدالت سے خارج کر دیا گیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقدمہ قاضی شریحؒ کی عدالت میں زیرِ سماعت تھا اور یہ مقدمہ اس لیے خارج ہو گیا تھا کہ حضرت علیؓ کے پاس اپنے غلام اور بیٹے کی گواہی کے علاوہ کوئی دوسری شہادت موجود نہ تھی، اور یہ شہادتیں اسلام کے قانونِ شہادت کے مطابق قابل قبول نہ تھیں۔ لہٰذا مقدمہ خارج ہو گیا۔ اسلام کے اس قدر بے لاگ انصاف کو دیکھ کر شریکِ مقدمہ یہودی اسلام لے آیا۔ چنانچہ سربراہِ مملکت کو حاصل خصوصی تحفظات ہوں یا ممبرانِ اسمبلی کا استحقاق ہو، یہ سب غیر اسلامی چیزیں ہیں۔ اسلام میں خلیفہ کو بھی کوئی خصوصی تحفظ یا مقامِ امتیاز حاصل نہیں ہے۔

البتہ اگر یہ ضرورت محسوس ہو کہ کہیں بد معاش قسم کے لوگ ہر وقت خلیفہ کو مقدمے بازی ہی میں نہ پھنسائے رکھیں تو سدِ باب بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملے میں حدِ قذف پر قیاس کرتے ہوئے اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ، وقت پر جھوٹا اور غلط مقدمہ دائر کرنے والے شخص کو بھی سزا دینے کا قانون بنا دیا جائے۔

(۱۰) مخلوط معاشرت کا سدِ باب

اس ایک بات میں سو باتیں جمع ہیں۔ اسلام کے سماجی نظام میں عورتوں اور مردوں کا دائرۂ کار علیحدہ اور جدا ہے۔ عورتوں کا جسمانی نظام بھی مردوں سے مختلف ہے اور نفسیاتی ساخت بھی جدا ہے، لہٰذا دونوں اصناف کی ذمہ داریاں جدا ہیں۔ حال کا معاملہ مردوں کے حوالے ہے اور قوم کا مستقبل عورتوں کے حوالے ہے، کیونکہ نئی نسل کی پرورش اور تربیت ہی تو مستقبل ہے۔ عورت کے لیے حمل کا زمانہ، بچے کو دودھ پلانے کا عرصہ اور پھر اس کی نگہداشت کیا یہ سب کچھ غیر اہم اور غیر پیداواری کام ہیں کہ اسے شمعِ محفل بنائے بغیر چارہ نہیں۔ اقبال نے کہا تھا ؎

ہتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوشِ شبیرؓ بگیری

اے مسلمان خاتون! تو اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جیسا کردار اختیار کر لے تو تیری گود میں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما جیسے پھول کھلیں گے۔ چنانچہ ہمیں ایسی خواتین درکار ہیں، ایسی ماؤں کی ضرورت ہے، ایسی بہنوں کی ضرورت ہے، ایسی ہی بیویوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں ہر جائی خواتین کی کوئی ضرورت نہیں۔ نظامِ خلافت میں خواتین اور مردوں کے دائرہ ہائے کار علیحدہ علیحدہ ہوں گے، اس لیے کہ یہ آگ اور پانی کا میل ہے۔ ہمیں مخلوط معاشرت کا مکمل خاتمہ کرنا ہوگا۔ سکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک، ہر جگہ تعلیمی ادارے الگ الگ ہوں۔ خواتین کے تعلیمی اداروں میں خواتین ہی پڑھنے والی ہوں اور خواتین ہی پڑھانے والی، اور دوسرا تمام عملہ بھی خواتین ہی پر مشتمل ہو۔ اسی طرح کا معاملہ ہسپتالوں کا بھی ہے۔ عورتوں کے ہسپتال میں خواتین ہی نرسیں ہوں، خواتین ہی ڈاکٹر ہوں اور خواتین ہی

ملازم ہوں' جبکہ مردوں کے ہسپتالوں میں مرد ڈاکٹر اور مرد نرسیں (male nurses) ہوں۔ اسی طرح کا معاملہ صنعتی اداروں میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اگر ارادہ ہو' ایمان ہو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی دی ہوئی تعلیم پر یقین کامل ہو تو ہر شے ممکن ہے' ہر مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔

روحِ عصر کا تقاضا

آخری بات اگرچہ نظامِ خلافت سے متعلق نہیں ہے لیکن یہ چیز روحِ عصر کا تقاضا ہے۔ ہم یہ بات کہتے ہیں کہ خلیفہ ایک ہی ہو اور خلیفہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کا محتاج نہ ہو۔ یہ نہیں ہوگا کہ وہ ہر وقت ادھر سے ادھر پھدکنے والے مینڈکوں کو ہی سنبھالتا رہے۔ آج کی دنیا میں رائج الوقت صدارتی نظام میں منتخب ہونے والے سربراہِ مملکت کو مقررہ مدت تک کام کرنے کا پورا موقع دیا جاتا ہے۔ وہ کسی کانگریس یا پارلیمنٹ کا محتاجِ محض نہیں ہوتا۔ یہ باتیں مغرب نے اسلام ہی سے سیکھی ہیں' اگرچہ ہم خود ان اوصاف سے محروم ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

یعنی اس دنیا میں جہاں کہیں کوئی خیر اور بھلائی کی روشنی نظر آتی ہے وہ یا تو براہِ راست حضور ﷺ کا عطیہ ہے یا ابھی انسانیت اس نور کی تلاش ہی میں سفر کر رہی ہے' قافلۂ انسانی کا رُخ اس طرف ہے اور وہ جلد یا بدیر ادھر ہی پہنچے گا۔

اس اعتبار سے ضروری ہے کہ موجودہ صوبوں کے معاملے کا بھی از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ پہلے ہی تین صوبے پنجاب کے بڑا ہونے پر شور مچاتے رہتے ہیں' حالانکہ بڑا بھائی ہونے کے ناطے پنجاب کو نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ سینٹ میں پنجاب کے بھی اتنے ہی نمائندے ہیں جتنے بلوچستان کے' حالانکہ بلوچستان کی کل آبادی لاہور شہر سے

بھی آدھی ہے۔ اسی طرح پانی کی تقسیم کے معاہدے میں پنجاب کو نقصان پہنچا ہے۔ ہر جگہ بڑا بھائی ہی مار کھا رہا ہے لیکن واویلا پھر بھی یہی ہے کہ پنجابی ہمیں لوٹ کر کھا گئے۔ صدارتی نظام میں یہ احساسِ محرومی اور بڑھ جانے کا خطرہ موجود ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ صوبوں کی نئی تقسیم عمل میں لائی جائے اور چھوٹے چھوٹے صوبے تشکیل دیے جائیں۔ یہ بات ضیاء الحق نے بھی کہی تھی اور اچھی بات کہی تھی۔ ملک کے خیر خواہ عناصر بھی یہی کہتے چلے آ رہے ہیں کہ صوبے چھوٹے کر دیے جائیں۔ ضیاء الحق مرحوم نے تو یہاں تک کہا تھا کہ پڑوسی ملک افغانستان کو دیکھو' وہ آبادی کے لحاظ سے ہمارا پانچواں حصہ ہے' لیکن صوبوں کے اعتبار سے ہم سے بارہ گنا بڑا ہے۔ افغانستان کے پچاس صوبے ہیں جب کہ اس کی آبادی صرف دو کروڑ ہے' لہٰذا یہاں پر بھی چھوٹے چھوٹے صوبے بنائے جائیں۔ نئی صوبائی تقسیم میں لسانی اور جغرافیائی عوامل کو بھی مدِنظر رکھا جائے اور ایک کروڑ کی آبادی سے زیادہ کوئی صوبہ نہ ہو۔ مولانا عبدالستار نیازی صاحب نے بھی نئی صوبائی تشکیل کی بات ارشاد فرمائی اور صحیح فرمائی ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ صوبے چھوٹے ہوں اور انہیں زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں۔

موجودہ دَور میں احیائے خلافت کا طریق کار

خلافت کا نظام کیا تھا اور اب کیسا ہوگا؟ میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے بغیر بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نظام اب قائم کیسے ہو؟ ایک قول مولانا ابوالکلام آزاد نے ہمیں یاد دلایا تھا جسے عموماً امام مالکؒ کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے لیکن بعض محقّقین کے مطابق یہ قول حضرت ابوبکرؓ کا ہے۔ ''لَا يَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ أَوَّلُهَا'' کہ اس امت کے آخری حصے کی اصلاح بھی اُسی طریق سے ہو سکتی ہے جس پر اس کے پہلے حصے کی اصلاح ہوئی۔ اس قول میں اوّل و آخر کا لفظ بڑا عجیب ہے۔ اوّل دَور خود حضور ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا دور ہے' جسے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے اور قیامت سے پہلے آخری دَور میں پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام قائم ہوگا۔ اس قول سے یہ بات

ہمارے سامنے آتی ہے کہ حضور ﷺ نے اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی جس طریقے سے قائم فرمایا تھا صرف اسی طریقے سے اب یہ نظام قائم ہو سکتا ہے۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہر شخص اپنی ذات میں اللہ کا خلیفہ بنے' پھر اپنے گھر اور دائرۂ اختیار میں خلافت کا حق ادا کرے' اس کا تقاضا پورا کرے' اور جو لوگ یہ دو مرحلے طے کر لیں انہیں بنیانِ مرصوص بنا کر ایک نظم میں پرو دیا جائے اور پھر یہی باطل کے ساتھ ٹکرا جائیں' میدان میں آ کر منکرات کو چیلنج کریں اور اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں کہ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

ہم نہ تو توڑ پھوڑ کے قائل ہیں اور نہ ہی دنگا فساد کو صحیح سمجھتے ہیں' کسی کی املاک کو نقصان پہنچانا بھی ہمارا کام نہ ہوگا' ہم کسی پر گولی نہیں چلائیں گے بلکہ اپنے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کروانے کے لیے کھول دیں گے کہ یا ہم نہیں یا کفر کا یہ نظام نہیں! لیکن یہ مرحلہ اس وقت آئے گا جب ہمارے پاس طاقت ہوگی۔ مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ بارہ برس تک بتوں کے بارے میں کہتے رہے کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے' لیکن بتوں کو توڑا نہیں' بلکہ آپؐ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت فرماتے رہے اور اپنی جمعیت کو بڑھاتے رہے' ان کا تزکیہ کرتے رہے۔ تب کہیں جا کر جہاد و قتال اور فتح و نصرت کے مراحل آئے۔ اور فتح مکّہ کے دن حضور ﷺ نے پہلا کام ہی بتوں کو توڑنے کا کیا کہ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ (بنی اسرائیل) شریعت میں نہی عن المنکر کا اصول موجود ہے کہ جب تک طاقت حاصل نہیں ہے زبان سے منکرات اور حرام باتوں پر نکیر کی جائے' جیسے ہم اس وقت کر رہے ہیں۔ سود حرام ہے' جوا حرام ہے' بے پردگی اور فحاشی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب باتوں کو ڈنکے کی چوٹ کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اگر ہم حق بات نہیں کہیں گے تو حدیث کے مطابق ہماری حیثیت ''گونگے شیطان'' جیسی ہوگی۔ ہم اللہ کی توفیق سے حق بات کو بیان کرتے رہیں گے اور جب طاقت حاصل ہو جائے گی تو باطل نظام کو چیلنج کیا جائے گا کہ اب یہ سب کچھ ہم نہیں

ہونے دیں گے۔ ایرانی انقلاب میں یہ طریقہ آزمایا جا چکا ہے۔ الیکشن میں ووٹوں کی بھیک مانگ کر آیت اللہ خمینی قیامت تک برسراقتدار نہیں آ سکتے تھے' وہاں انقلاب نہیں آ سکتا تھا۔ یہی طریقہ کار پاکستان میں اہل تشیع نے ضیاء الحق کے زکوٰۃ آرڈیننس کو منسوخ کرانے کے لیے استعمال کیا اور کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ اہلِ تشیع کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا گیا اور یوں اہلِ سُنّت کو شیعہ بنانے کا راستہ کھول دیا گیا۔

احیائے خلافت اور پاکستان کا مستقبل

نظامِ خلافت کیسے قائم ہوگا؟ کس تدریج سے قائم ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے بھی پہلے اسے سرزمینِ عرب میں قائم کیا' پھر وہ تدریج کے ساتھ آگے پھیلتا چلا گیا۔ اب بھی کسی ایک ملک سے ہی آغاز ہوگا۔ یہ کون سا ملک ہوگا! ہم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے' لیکن مسلمانوں کی گزشتہ چار سو سال کی تاریخ کے جائزے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کی سرزمین کو نظامِ خلافت کے احیاء کے لیے پسند فرمایا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ گزشتہ چار سو سال کے دوران عالم اسلام کی تمام بڑی شخصیات برعظیم پاک و ہند میں پیدا ہوئیں۔ اس کے علاوہ اس خطے میں بڑی عظیم دینی تحریکیں اُٹھی ہیں۔ گیارہویں صدی ہجری میں مجددِ اعظم شیخ احمد سرہندی مجددِ الف ثانی کی شخصیت' بارہویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسی جامع صفات شخصیت' تیرہویں صدی میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید اور ان کی تحریک شہیدین' چودھویں صدی میں مولانا محمود حسن جیسی سیماب وش شخصیت اور دار العلوم دیوبند کی عظیم تحریک' مولانا الیاس جیسا مبلّغِ دین اور تبلیغی جماعت' مولانا ابو الکلام آزاد جیسا داعیٔ قرآن' مولانا مودودی مرحوم جیسا بلند پایہ مصنف و داعی' علامہ اقبال مرحوم جیسا مفکّر اور ترجمان القرآن......
(رحمہم اللہ اجمعین) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی برعظیم میں پاکستان جیسا ملک وجود میں آیا جو صرف اسلام کے نام پر قائم ہوا۔ یہ تمام واقعات محض اتفاقات قرار نہیں دیے جا سکتے' بلکہ یہ اس بات کی جانب واضح اشارے معلوم ہوتے ہیں کہ اللہ کی حکمت میں اس علاقے کے لوگوں کو کوئی اہم کردار ادا کرنا ہے۔ ہم میں سے ہر مسلمان کی یہ خواہش اور

آرزو ہونی چاہیے کہ یہ ''رتبۂ بلند'' ہمیں ملے' یہ سعادت ہمارے حصے میں آئے۔ لہٰذا ہمیں اس مقصد کے لیے کوشش کرنا چاہیے' احیائے خلافت کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔ اس کے لیے' جیسا کہ میں نے عرض کیا' ایک جماعتی نظم ناگزیر ہے۔ ہم نے اسی محنت اور کوشش کے لیے تنظیم اسلامی قائم کی ہے۔ آپ لوگ اگر اپنا تَن' مَن اور دھن لگانے کے لیے تیار ہوں تو آگے بڑھیے' ہمارے دست و بازو بنیے' تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کیجیے! لیکن اگر ابھی ارادہ اتنا قوی نہیں ہے تو تحریک خلافت کے منشور کو عوام میں زیادہ سے زیادہ پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے اور اس کے لیے تحریک خلافت کی معاونت اختیار کیجیے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ﴾

(المائدۃ:۲)

کہ نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو —— اور گناہ اور زیادتی کے معاملات میں باہم تعاون مت کرو!!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ O

افہام و تفہیم

نظام خلافت کے بارے میں سامعین کی جانب سے اٹھائے گئے بعض اہم سوالات

اور داعی تحریک خلافت کے جوابات

سوال: اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس بات کی وضاحت کر دیں کہ کسی ملک میں پہلی دفعہ خلافت کیسے قائم ہو گی؟ انقلاب کے ذریعے قائم شدہ خلافت میں تمام لوگوں کی رائے اور مشورہ کیسے شامل ہو گا؟

جواب: دیکھئے جب بھی کبھی دنیا میں انقلاب آتا ہے تو پہلی گورنمنٹ انقلابی پارٹی ہی بناتی ہے۔ اس کے بعد اس کا جو ڈھانچہ اور دستوری خاکہ وہ بنائے گی اس کے تحت الیکشن ہو جائیں گے۔ اس میں دو سال بھی لگ سکتے ہیں' تین سال بھی اور چار سال بھی لگ سکتے ہیں' یہ عبوری دَور ہو گا۔ اس اعتبار سے ذہن بالکل صاف ہونا چاہیے کہ انتخابی عمل کے ذریعے خلافت قائم نہیں ہو سکتی' اس کے لیے تو انقلابی عمل ناگزیر ہے جسے میں بار بار دہراتا ہوں تاکہ ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو جائے اور اس کا عمومی طریقہ یہی ہے کہ کوئی منظم انقلابی پارٹی اس نظام کے قیام کے لیے منہاجِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق جدوجہد کرے۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! خلافت کا مطلب صدارتی نظام تو نہیں؟

جواب: خلافت کا نظام صدارتی نظام سے قریب تر ہے' بلکہ صحیح تر الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ صدارتی نظامِ خلافت کے نظام سے قریب تر ہے۔ میں یہ ہمیشہ سے کہتا آ رہا ہوں کہ پارلیمانی اور صدارتی دونوں نظام جائز ہیں۔ وحدانی (Unitary) نظام' وفاقی (Federal) اور کنفیڈرل (Confederal) نظام سب جائز ہیں' کنفیڈریشن کو بھی آپ حرام نہ سمجھئے۔ ہماری آج کتنی خواہش ہو گی کہ سابقہ مشرقی پاکستان کی اور ہماری کنفیڈریشن ہی ہو جائے! اگر آج پاکستان میں کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں کنفیڈریشن ہونی چاہیے تو آپ ان سے بات کریں' اس پر بحث کریں اور دلائل دیں' لیکن اسے حرام تو نہیں کہہ سکتے۔

دنیا میں کئی سیاسی نظام چل رہے ہیں: وحدانی صدارتی، وفاقی صدارتی (جیسے امریکہ میں ہے جو وحدانی نہیں)، کنفیڈرل صدارتی، پھر وحدانی پارلیمانی، وفاقی پارلیمانی اور کنفیڈرل پارلیمانی، یہ چھ کے چھ جائز ہیں۔ البتہ خلافت راشدہ سے قریب تر صدارتی نظام ہے۔ لیکن اس میں کیا قباحت ہے کہ یہ نظام ساتھ ساتھ وفاقی بھی ہو، پاکستان کے حالات میں جس کی زیادہ ضرورت ہے۔ ہمیں پسند ہو یا ناپسند، یہاں پر قومیتوں کا تصور اب پیدا ہو چکا ہے اور ہر قوم اپنا حق مانگتی ہے۔ اسے اپنی زبان عزیز ہے کہ سوائے عربی زبان کے کوئی دوسری زبان مقدس نہیں۔ ''اردو شریف'' آسمان سے نازل نہیں ہوئی، انسانوں ہی کی زبان ہے اور سندھی کوئی کافروں کی زبان نہیں۔ غیر عربی تفسیر سب سے پہلے سندھی زبان میں لکھی گئی۔ تہذیب کا اور اسلامی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز سندھ تھا۔ ایک زمانے میں تین سو دارالعلوم سندھ کے ایک شہر ٹھٹھہ ہی میں تھے۔ یہاں کے محدثین نے حجاز میں جا کر حدیث پڑھائی۔ یہ کوئی معمولی بات ہے؟ اس اعتبار سے کوئی حرج نہیں ہے کہ صوبے لسانی بنیاد پر بھی بن جائیں۔ ہندوستان نے اسی بنیاد پر صوبوں کی نئی حد بندی کر لی، وہاں کتنی مضبوط جمہوریت ہے۔ وہاں پینتالیس برس کے اندر صرف دو سال ہی ہنگامی حالات کے گزرے ہیں نا! ورنہ ان کی آئینی حکومت ہی کا تسلسل چل رہا ہے۔ انہوں نے نئے لسانی صوبے بنا لیے تو کیا کوئی حرام یا غلط کام ہو گیا؟

صدارتی نظام یقیناً خلافت کے نظام کے قریب تر ہے اور روحِ عصر کے مطابق وہ وفاقی صدارتی نظام ہے۔ وفاق کی اکائیوں کو کافی خود اختیاری حاصل ہونی چاہیے۔ اسی لیے ہمارا موقف ہے کہ صوبے زیادہ بنا دو اور سب کو برابر برابر کر دو تاکہ کسی کے غلبے کا اندیشہ ہی نہ رہے۔ اس معاملے کو اسی انداز میں سلجھایا جائے تو ان شاء اللہ ایسے سب مسائل کا حل نکل آئے گا۔ چنانچہ ہمارا جو دس نکاتی پروگرام ہے اس میں دین کے نظام یا خلافت کے نظام میں ملکی حوالے سے بھی جو صورت ہمارے لیے صحیح ترین ہو سکتی ہے، وہی ہمارے پیش نظر ہے۔

سوال: منصبِ خلافت کے امیدوار اپنے طور پر سامنے آئیں گے یا ان کی چھان بین

اوران کے لیے انتخابی مہم اسلامی نقشے پر ہوگی؟ صرف شکل وصورت میں شریعت ہوگی یا عمل میں بھی؟

جواب: ظاہر ہے کہ صرف شکل وصورت میں تو نہیں' شریعت عمل ہی میں درکار ہے اور سارا ہی اسلام ہم اسی طرح چاہتے ہیں۔ دستور میں طے ہو کہ ہر شے پر کتاب وسُنّت کی بالادستی ہے تبھی خلافت کہلائے گی' ورنہ تو خلافت ہے ہی نہیں۔

سوال: نظامِ خلافت میں حزبِ اختلاف کی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب: پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ نظامِ خلافت کے بارے میں یہ بھی مغالطہ ہے کہ وہ یک جماعتی (One party) گورنمنٹ ہوتی ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ اس زمانے میں پارٹیاں اس معنی میں نہیں تھیں' لیکن گروپ تو تھے: بنوامیہ' بنو ہاشم' اوس' خزرج وغیرہ۔ نظام قبائلی تھا۔ اب اس کی جگہ پارٹیوں کا نظام ہے جو حرام نہیں ہیں۔ یہ میں ضیاء الحق کے زمانے میں بھی کہتا رہا ہوں۔ انہوں نے غیر جماعتی الیکشن کرایا تو میں نے کہا تھا کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اسلام میں پارٹیوں کا جواز ہے۔ البتہ کسی پارٹی کے منشور میں کتاب و سنت کے خلاف کوئی بات ہوئی تو وہ خلافِ قانون قرار دے دی جائے گی' اس لیے کہ اس ملک کے دستور کے اندر کتاب وسنت کی بالادستی تسلیم کی گئی ہے۔ شریعت کی حدود کے اندر اندر ایک پروگرام آپ دیتے ہیں' دوسرا پروگرام کوئی اور دیتا ہے تو ٹھیک ہے' لوگوں کو دیکھنے کا موقع دیں کہ کون سا پروگرام زیادہ بہتر ہے۔ کتنے ہی مسائل ہیں جن پر ہر پارٹی کا پروگرام سامنے آنا چاہیے۔ مثلاً بجٹ میں اخراجات کا مصرف کیا ہوگا؟ صحت کو کیا دیں گے' دفاع کو کتنا دیں گے اور تعلیم کو کتنا؟ یہ قرآن میں تو لکھا ہوا نہیں' نہ حدیث ہی میں لکھا ہوا ہے۔ ایک پارٹی کہتی ہے کہ ہماری اوّلین ترجیح دفاع ہے' دوسری پارٹی کہتی ہے کہ ہم تعلیم کو زیادہ اہمیت دیں گے تو لوگوں کو اپنی پسند کے انتخابات کا موقع ملنا چاہیے' اس میں قطعاً کوئی برائی نہیں۔ روحِ دین کے ساتھ جب تک روحِ عصر کو نہیں جوڑیں گے' بات نہیں بنے گی۔ چنانچہ جدید زمانے کے تقاضوں اور دین کی ضروریات کو ہم آہنگ کرنا ہوگا۔

البتہ حزبِ اختلاف کا ایک پہلو غیر اسلامی ہے' اور وہ ہے حزبِ اختلاف کے ارکان کا اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف رائے دینا۔ آپ ایک پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں جس کا ایک منشور ہے اور لوگوں نے اس منشور پر ووٹ دیے تو اگر آپ اس منشور سے منحرف ہوتے ہیں پھر تو آپ کا ایوان میں اپنے منصب سے چمٹے رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ البتہ بہت سے معاملات ایسے آجاتے ہیں جن کا تعلق منشور سے نہیں۔ اب گورنمنٹ پارٹی ایک بات کہہ رہی ہے اور اپوزیشن کے کسی شخص کا دل یہ کہتا ہے کہ دین کے اعتبار سے میرے ملک کے لیے بات یہی صحیح ہے جبکہ پارٹی کی حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ تمہارا ضمیر جائے جہنم میں' تمہیں وہ بات کہنی ہوگی جو تمہاری پارٹی کہہ رہی ہے۔ یہ چیز خلافِ اسلام ہے کہ انہیں اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرنے کی اجازت نہیں۔ تاہم صدارتی طرزِ خلافت میں اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہ جاتی' اس لیے کہ اس کی اہمیت وہاں ہوتی ہے جہاں اراکین کی تعداد کے توازن پر حکومت کا انحصار ہو۔ ایک ہی مسئلے یا ایک تحریک پر بھی اگر حکومتی جماعت شکست کھا جائے تو وزارت ختم۔ صدارتی نظام میں ایسا نہیں ہوتا' لہٰذا پارٹیاں مسئلہ نہیں بنتیں۔ اس میں جو چاہیں آپ اپنی رائے دیں' کیونکہ حکومت اس سے نہ گرتی ہے نہ بنتی ہے۔ خلیفہ جو براہِ راست منتخب ہوگا' جتنی اس کی مدت ہے چار سال یا پانچ سال اتنی مدت وہ رہے گا' الا یہ کہ قانون کے مطابق اس کی معزولی کا جواز پیدا ہو جائے۔

سوال: ایک خلیفہ پر سے اگر عوام کا اعتماد اٹھ جائے تو اس کی تبدیلی کا کیا طریقہ ہوگا؟

جواب: وہ تو میں نے بتا ہی دیا ہے کہ جب ہم نے یہ طے کر لیا کہ اس کی مدت چار سال یا پانچ سال کی ہے تو ٹرم (term) پوری کرنے کے بعد دوبارہ الیکشن ہونے ہی ہیں۔ خلافت راشدہ میں تو یہ تھا کہ ایک شخص منتخب ہو گیا اور تادمِ مرگ وہ خلیفہ رہا' لیکن یہ آپ پر واجب نہیں کیا گیا' کیونکہ ایک ٹرم معیّن کر دینا حرام نہیں ہے۔ دوسرا معاملہ عوام کا اعتماد اٹھنے کا نہیں' بلکہ معزولی کا ہے۔ اگر آپ اسے معینہ مدت کے اندر معزول کر دیتے ہیں تو ہٹ جائے گا' ورنہ نہیں۔

سوال: اگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت اس لیے خلافت راشدہ نہیں کہ انہیں تمام مسلمانوں نے منتخب نہیں کیا تھا تو بتائیں کہ اوّلین چار خلفاء میں سے کس کو کُل مسلمانوں نے منتخب کیا؟ اگر نہیں تو پھر امیر معاویہؓ کی خلافت' خلافت راشدہ کیوں نہیں؟

جواب: کُل مسلمانوں کے انتخاب کا موجودہ تصور تو اُس وقت تھا ہی نہیں۔ رائے دہی کا یہ نظام اس وقت موجود نہیں تھا۔ لیکن پہلے چاروں خلفاء کا انتخاب ان کے اپنے دعویٰ پر نہیں ہوا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خود مدعی خلافت نہیں تھے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تجویز کیا کہ ہاتھ بڑھایئے' پھر خود بیعت کی۔ حالانکہ ابوبکرؓ نے تو یہ کہا تھا کہ یہ عمر اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما دونوں موجود ہیں' حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے ہیں کہ وہ ان دونوں سے خوش تھے' جس کو چاہو منتخب کرلو۔ اسی طرح سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدعی نہیں تھے' حضرت ابوبکرؓ نے مشورہ کر کے انہیں منتخب کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا معاملہ چھ صائب الرائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورے سے ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ افراد کی جماعت بنائی اور پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عام مسلمانوں سے بھی مشورے کیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بلوائیوں نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو مجبور کیا کہ وہ بیعت قبول کرلیں۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ابتداءً حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی انکار کیا تھا کہ یہ فتنے کا وقت ہے' اور میں اس حال میں بیعت قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں' لیکن جب ان کا دباؤ پڑا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی دیکھا کہ اگر بغیر خلیفہ کے یہ نظام زیادہ دیر تک چلتا رہا تو انتشار بڑھ جائے گا تو انہوں نے اصلاحِ احوال کے پیش نظر خلافت قبول کرلی۔ جب کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی پشت پر ایک قبائلی قوت تھی جس کا شام کے اندر ایک مرکز قائم ہوا۔ میں ان کی نیت پر کوئی حملہ نہیں کر رہا' معاذ اللہ! وہ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' لیکن ان کی خلافت اس طور سے منعقد نہیں ہوئی جیسے پہلے چاروں خلفاء کی ہوئی تھی۔ یہ فرق ہے جس کی بنا پر خلافت راشدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر ختم ہوئی' بلکہ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے تو یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنی ذات میں خلیفۂ راشد ہیں' لیکن ان کا دورِ خلافت راشدہ میں شامل

نہیں۔ کیوں نہیں؟ اس لیے کہ عالم اسلام ان کے زمانے میں یکجا نہیں ہوا۔ البتہ اہلِ سنّت کا تقریباً اجماع ہے (سوائے ایک شاذ رائے کے) کہ ان چاروں خلفاء کا زمانہ دورِ خلافت راشدہ ہے۔

سوال: موجودہ زمانے میں حجاب کو قائم رکھتے ہوئے پاکستان میں کس طرح ہم اپنی تمام دینی بہنوں بیٹیوں کو زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں شریک کر سکتے ہیں کہ ماؤں کی گھریلو مصروفیت اور بچوں کی شریعت کے اعتبار سے تربیت بھی زیادہ متاثر نہ ہو؟

براہ کرم یہ بھی بتائیے کہ اس بڑھتی ہوئی بے حجابی کے سیلاب کو کس طرح روکا جائے؟

جواب: دیکھئے میں نے یہ نہیں کہا کہ عورتوں کے لیے کام کرنا لازم ہے۔ میں تو شریعت کا یہ حکم بتا رہا ہوں کہ ان کے لیے کام کرنا حرام نہیں۔ کوئی ایسی عورت ہے جس کا شوہر فوت ہو گیا ہے، وہ اپنے بچوں کے لیے زکوٰۃ و خیرات نہیں لینا چاہتی بلکہ کام کرنا چاہتی ہے تو وہ گھر میں بیٹھ کر کام کرے۔ ہماری کتنی ہی خواتین ہیں جو بیوہ ہو گئیں اور انہوں نے سلائی کڑھائی کر کے بچوں کو پالا۔ لیکن یہ کام ہوتا ہے گھر میں بیٹھ کے۔ اس کے لیے آپ گھریلو صنعت کو رواج دیجئے۔ کام کرنے میں کیا برائی ہے؟ باقی ہر میدان میں کاندھے سے کاندھا ملا کر عورتوں کو لانا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر ان کے میدان ہی علیحدہ بنائے ہیں۔ لیکن مجبوری ہو، ایمرجنسی ہو تو یہ حرام نہیں ہے کہ کوئی خاتون گھر سے باہر جا کر کام کرے، لیکن اس صورت میں وہ اپنے ستر اور حجاب کے تقاضوں کو پورا کرے گی اور جا کر ملازمت کر کے واپس آ جائے گی، یہ حرام نہیں ہے۔ ستر اور حجاب کی پابندیوں کے ساتھ بھی ان چیزوں کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ لیڈی ڈاکٹر بننا چاہتی ہے بنے، لیکن پائلٹ بننا بھی کوئی فرض ہے؟ یہ تو ترقی پسندوں کا نظریہ ہے کہ ہر میدان میں کندھے سے کندھا ملایا جائے۔ حالانکہ کندھے سے کندھا آج تک نہیں ملا اور امریکہ میں بھی آج تک کوئی عورت صدرِ ریاست نہیں بنی۔ لیکن انہوں نے ہم لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے اور پاگل بنانے کے لیے ''مساواتِ مرد و زن'' کا نعرہ لگایا ہے۔ ورنہ وہاں کیوں نہیں کوئی عورت آج تک صدر بن گئی؟ تو اس اعتبار سے یہ ہر میدان کی

ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ایمرجنسی میں کوئی ضرورت ہو جو قومی سطح پر بھی پیش آ سکتی ہو تو دوسری بات ہے۔

اب ہمارا یہ کہنا کہ ہم نے امریکہ سے دشمنی مول لے لی ہے' فلاں سے دشمنی مول لے لی ہے اور اب ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے' لہٰذا جب تک صنعتی پیداوار نہیں بڑھے گی ہم کیسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں گے' چنانچہ اس کے لیے عورتوں کو بھی کام کرنا چاہیے —— تو ٹھیک ہے' کریں عورتیں کام' لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ترجیحات کی ترتیب یہ ہوگی کہ سب سے پہلے گھریلو صنعت کو رواج دیں تاکہ عورت گھر میں رہ کر کام کر سکے' نہ کہیں آنا جانا ہو' نہ گھر سے نکلنا ہو اور نہ وقت صرف ہو تو قومی سطح پر پروڈکشن میں تو اس کا حصہ ہو گیا۔ پھر آپ ایسے صنعتی یونٹ بنا دیں جس میں آٹھ گھنٹے کی بجائے چار گھنٹے کی شفٹ ہو۔ عورت چار گھنٹے بآسانی نکال سکتی ہے کہ اس کے بعد وہ گھر کے کام بھی کرے۔ اس میں البتہ یہ ضروری ہے کہ عورتوں کا ہی یونٹ ہو' عورتیں ہی اس کی نگرانی کریں اور اختلاطِ مرد و زن نہ ہو۔ یہ ساری چیزیں آپ کو کرنی پڑیں گی۔ لوگوں کو اس اعتبار سے سمجھانا ہوگا۔

❀ ❀ ❀

نظامِ خلافت کیا ہے؟

☆ نظامِ خلافت' اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کے اعلان و اقرار اور قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی کے عملی نفاذ کا نام ہے۔

☆ نظامِ خلافت' اسلامی ریاست کے ہر شہری' مسلم ہو یا غیر مسلم' کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔

☆ نظامِ خلافت' اسلامی ریاست کے ہر شہری کی بنیادی ضروریات یعنی غذا' لباس' رہائش' علاج و تعلیم وغیرہ کا ذمہ دار ہے۔

☆ نظامِ خلافت' تمام کائنات اور انسانوں کے خالق و مالک کے ابدی پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں تک پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے۔

☆ نظامِ خلافت' اسلامی ریاست کے تمام شہریوں کو فوری عدل و انصاف فراہم کرنے کا ضامن ہے۔

☆ نظامِ خلافت میں مردوں اور عورتوں کے الگ الگ دائرہ کار معین ہیں۔ یہ نظام عورت کو پورا اختیار دیتا ہے کہ ستر و حجاب کے حوالے سے اللہ اور رسول ﷺ کی قائم کردہ حدود کو پیش نظر رکھتے ہوئے بوقتِ ضرورت کاروبارِ حیات میں شرکت کر سکے۔

☆ نظامِ خلافت' عورتوں کی عزت و ناموس کا محافظ اور حقوقِ نسواں کا پاسبان ہے۔

☆ نظامِ خلافت' نہ صرف یہ کہ تمام انسانوں کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام اس نقطہ نگاہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنے مقصدِ حیات سے آگاہ ہوں' بلکہ اس کے مطابق ان کی رہنمائی اور مدد بھی کرتا ہے۔

☆ نظامِ خلافت' مسلمانوں کے دلوں میں جذبہ جہاد کی روح بیدار کرنے کا ضامن بھی ہے' تاکہ حزب الشیطان کے حملوں کا مؤثر جواب دیا جا سکے۔

خلاصہ کلام: نظامِ خلافت کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے!

تحریکِ خلافت پاکستان

نظامِ خلافت کے قیام کی جانب پہلا قدم ہے۔

تحریک کے مقاصد حسب ذیل ہیں:

(۱) نبی اکرم ﷺ کی واضح پیشین گوئیوں کے مطابق پورے کرۂ ارض پر نظامِ خلافت کے قیام کی راہ ہموار کرنا۔

(۲) نظامِ خلافت کی برکات سے پاکستان اور تمام دنیا کے مسلم و غیر مسلم افراد کو متعارف کروانا۔

(۳) رائج الوقت غیر فطری، ظالمانہ اور استحصالی نظاموں کی گمراہیوں اور خرابیوں سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔

(۴) مسلمانانِ عالم میں دین کے تقاضوں کا شعور بیدار کرنا۔

(۵) ابتدائی مرحلے کے طور پر پاکستان کے عوام کو ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا جہاں سے مذہبی فرقہ واریت اور انتخابی سیاست سے بالاتر ہو کر نظامِ خلافت کے قیام کے لیے منظم جدوجہد کی ضرورت کا احساس پیدا کیا جا سکے۔

SBU805S